نایاب

دن کی اک اک بوند گراں ہے اک اک جرعۂ شب نایاب
شام و سحر کے پیمانے میں جو کچھ ہے ڈر ڈر کے پیو
آہستہ آہستہ برتو ، ان گنتی کی سانسوں کو
دل کے ہاتھوں میں شیشۂ جاں ہے قطرہ قطرہ کر کے پیو
(مصطفےٰ زیدی)

از

افروز سعیدہ

یہ کتاب اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کے جزوی تعاون سے شائع ہوئی ہے

نام کتاب	"نایاب"
نام مصنفہ	افروز سعیدہ
سنہ اشاعت	اگسٹ ۱۹۹۴ء
تعداد اشاعت	پانچ سو
صفحات	136
قیمت	چالیس روپیے
کمپیوٹر کتابت	"اردو کمپیوٹر سنٹر
-	35/M/181-1-17 روبرو جامعہ عائشہ نسوان
-	داراب جنگ کالونی، مادنا پیٹ
-	حیدرآباد ۵۰۰۰۶۵۹ (اے۔پی)
سرورق	میر اکرم علی
طباعت	سائی گرافکس آفسیٹ پریس حیدرآباد۔

=========== ملنے کا پتہ ===========

فہرست مضامین

سخن فہم اور نظر شناس قارئین کی نذر
والدین کے نام

والد نے میری رگ رگ میں اردو زبان کی محبت بھر دی اور میرے شوق کے پروں کو پرواز دی انہیں دیوان غالب ازبر تھا اور والدہ نے میرے ہاتھ میں ڈوئی اور سوئی کے بجائے قلم تھمایا تھا۔

سوغات

مصطفیٰ قاسمی، مجتبیٰ قاسمی، اظہر اعجاز اور ننھے زبیر کے لیے

انتساب

محفل خواتین کی محترمہ سلطانہ شرف الدین صاحبہ، محترمہ فاطمہ عالم علی صاحبہ اور پروفیسر حبیب ضیاء صاحبہ، جناب اکرام جاوید صاحب، راج بہادر گوڑ صاحب اور جناب ہاشم سعید صاحب جن کی ہمت افزائی نے مجھے اپنے افسانوں کا مجموعہ چھپانے کی طرف راغب کیا۔

پیش لفظ

حیدرآباد کی نئی اور ابھرتی ہوئی افسانہ نگار خاتون افروز سعیدہ تعارف کی محتاج نہیں۔ متمول اور مہذب گھرانے سے تعلق رکھنے والی یہ خاتون گزشتہ کئی برسوں سے افسانے لکھ رہی ہیں اور محفل خواتین کی ادبی محفلوں میں ان کے افسانے بے حد پسند کیے جاتے ہیں

افروز سعیدہ کے افسانوں کے موضوعات میں تنوع ہے گہرائی ہے اور بعض افسانے اپنے اندر اتنی سچائی رکھتے ہیں کہ قاری سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ چند افسانوں میں انہوں نے عورت کی مظلومیت کی طرف واضح اشارے کیے ہیں اور مرد کو نشانہ، ملامت بنایا ہے۔

ادھورے خواب، فیصلہ، خزاں رسیدہ، پشیماں ان کے بہترین افسانے ہیں۔

اچھے مکالمے لکھنا ہر ادیب کے بس کی بات نہیں۔ افروز سعیدہ مکالمہ نگاری کے فن سے خوب واقف ہیں۔ کئی افسانوں میں انہوں نے اردو زبان سے تھوڑی سی واقفیت رکھنے والا بھی ان کے افسانے نہ صرف پڑھ سکتا ہے بلکہ افسانے کے مرکزی خیال پر غور و فکر بھی کر سکتا ہے۔

خدائے تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اسی طرح لکھتی رہیں۔ افسانوں کے پہلے مجموعے کی اشاعت پر میں انہیں دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

ڈاکٹر حبیب ضیا،
پرفیسر و صدر شعبہ، اردو
یونیورسٹی کالج فار ویمن (کوٹھی) جامعہ عثمانیہ

کچھ اپنے بارے میں

اسی سرزمین محبت حیدرآباد کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئی ۔ میرا نام اسکول و کالج میں سعیدہ خاتون تھا ۔ بعد میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ افروز سعیدہ رکھا گیا ۔ ۱۹۶۲ میں ریڈی کالج سے بی ایس سی اور ۶۴ میں بی اے کیا ۱۹۶۲ میں ہی شادی کر دی گئی حصول علم کی پیاس بجھی نہ تھی ایم اے کرنے کی آرزو تھی غم دوراں نے سنبھلنے نہ دیا ۔ اسلئے ۱۹۹۱ میں ایم اے (فرسٹ ڈیویژن) پاس کر کے اپنی دیرینہ آرزو کی تکمیل کی ہے ۔

میرے دادا نواب سخاوت جنگ بہادر اول تعلقہ دار تھے ۔ انکے پانچ میں سے ایک سپوت جناب شرافت حسین کسٹم آفیسر مرحوم کی پہلی اولاد ہوں ۔ والد محترم ادبی ذوق سے معمور شخصیت کے مالک تھے ۔ منکرالمزاج اور ملنسار خوش دل و خوش گفتار واقع ہوئے تھے ۔ مجھے اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے تھے لیکن والدہ محترمہ کے کہنے پر گریجویشن کے بعد ہی شادی کرنے پر مجبور ہو گئے ہم چار بھائی بہن ہیں ۔ ایک بھائی شباہت حسین افسر جو میکانیکل انجینیر ہیں شعروادب سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں ۔ دوسرے وجاہت حسین انور بی کام مقیم سعودی عربیہ ۔ ایک بہن حمیدہ تسکین جو حسینی پاشاہ چشتی قادری نقشبندی کی زوجہ ہیں ۔ میرے صرف دو لڑکے ہیں مصطفیٰ قاسمی اور مجتبیٰ قاسمی ان کے والد مرتضیٰ قاسمی ایجوکیشن آفیسر اورنگ آباد (مہاراشٹرا) ہیں جو اپنی دوسری منکوحہ کے ساتھ آسودگی کی زندگی گزار رہے ہیں کالج کے زمانے سے مجھے لکھنے کا شوق تھا ۔

اس زمانے میں ریڈی کالج میں محترمہ جہاں بانو نقوی ہماری لکچرار تھیں بانو آپا نے میری ہمت افزائی کی اور میرے ذوق کو سراہا تھا ۔ بیت بازی میں حصہ لینا افسانے و مضامین لکھنا اور سنانا ۔ ڈراموں میں کام کرنا میرے محبوب مشغلے رہے ہیں کالج کا وہ دن میں آج تک نہ بھول سکی جس دن کالج کا سالانہ فنکشن تھا بانو آپا نے ایک ٹیبلو کیلئے میرا انتخاب کیا تھا ۔ مجھے مرزا غالب بنایا گیا تھا ۔ اتفاق سے مجھے اس دن 102 ڈگری بخار تھا ۔ چہرہ پھولا ہوا ، آنکھیں سرخ انگارہ سی تھیں ۔ ایک شرابی کا سا

حلیہ تھا۔ مجھے گاؤ تکیے سے بٹھا کر ساغر و مینہ سامنے رکھا گیا اور میری ایک کلاس میٹ لکشمی کو انار کلی کے لباس میں بٹھایا گیا اور کسی نے بڑی پر کشش آواز میں غالب کا شعر پڑھا ؎

ہاتھوں میں نہیں جنبش آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینہ میرے آگے

فنکشن کے تمام آئیٹمس میں ہمارے ٹیبلو کو بیحد پسند کیا گیا۔ بہت مبارکباد ملی تھی اور میں بس بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

میں نے 1976 تا 1980 آل انڈیا ریڈیو پر بہنوں کے پروگرام میں اپنے افسانے سنائے اور بچوں کے لیے بھی لکھا اور سنایا اظہر افسر صاحب اردو سیکشن کے ڈائرکٹر نے مجھے کئی بار موقع دیا۔ اس کے علاوہ خاتون مشرق، حریم، پونم اور بانو میں میرے افسانے چھپ چکے ہیں اور ایک افسانہ "یادیں" کے عنوان سے عرب ٹائمز کویت 2 / جولائی 1980 میں چھپا تھا۔ 1980 میں ایک دن "محفل خواتین" میں شرکت کا موقع ملا اس وقت عظمت آپا بھی تھیں (عظمت عبدالقیوم) میں نے اپنا ایک افسانہ سنایا "شام غم کی قسم" عنوان تھا۔ عظمت آپا سلطانہ آپا اور فاطمہ باجی نے افسانہ پسند کیا اور ہمت افزائی کی۔ میں آج بھی اس محفل سے وابستہ ہوں

افسانوں کے اس مجموعہ کو چھپانے کی بری خواہش تھی لیکن میں کہہ نہیں سکتی کہ میں کہاں تک کامیاب ہوں۔ خصوصاً اکرام جاوید صاحب اور سلطانہ باجی کی ہمت افزائی کی بنا پر اس مجموعہ کو کتابی شکل دینے کی جرأت کر سکی ہوں۔ میں راج بہادر گوڑ صاحب، اور پروفیسر حبیب ضیاء صاحبہ کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے بے حد قیمتی وقت سے وقت نکال کر میرے افسانوں کا مطالعہ کیا اور ان پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

افروز سعیدہ

افروز سعیدہ کے افسانوں کا مجموعہ

جو لڑکی اسکول اور کالج میں سعیدہ خاتون تھی وہ عورت بنی تو افروز سعیدہ ہوگئی۔ پی۔ ایس۔ سی (۱۹۶۲ء میں) تب ہی شادی کردی گئی لیکن پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ اور کچھ ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے والد نواب شرافت حسین بہت اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ سعیدہ نے شادی کے بعد بھی تعلیمی کاوشیں جاری رکھیں۔ ۱۹۶۴ء میں بی۔ اے کیا اور پھر ۱۹۹۱ء میں اول درجہ سے ایم۔ اے کیا۔

ان کے ۲ بھائی ہیں اور ایک بہن ہیں۔ دونوں بھائی شعری ذوق رکھتے ہیں افسر اور انور تخلص ہے۔ بہن حمیدہ انعام یافتہ خوشنویس ہیں۔ سعیدہ کے دو لڑکے ہیں مصطفیٰ قاسمی اور مجتبیٰ قاسمی ان کے والد اورنگ آباد میں ایجوکیشن آفیسر ہیں۔

سعیدہ کی زندگی دکھ بھری داستان ہے۔ اور ساتھ ہی سخت کشمکش کا ذریعہ بھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو جو بھی ہے خود بنایا ہے۔ ریڈیو پر کہانیاں نشر کی ہیں۔ اور محفل خواتین میں بھی اپنی کہانیاں سنائیں اور داد حاصل کی ہے۔ محفل خواتین میں سنائی ہوئی ایک کہانی "شام غم کی قسم" اس مجموعہ میں شامل ہے۔

سعیدہ کو کہانیاں لکھنے، ڈراموں میں کام کرنے کا شروع سے ہی شوق رہا ہے وہ حیدرآباد کی مشہور شخصیت (روزنامہ پیام کے پرانے پڑھنے والے ان کی محاورانہ تحریروں سے واقف ہونگے) جہاں بانو نقوی کی شاگرد رہی ہیں اور انھوں نے ہی ان کے حوصلے بڑھائے اور لکھنے کی ترغیب دی۔

سعیدہ کی کہانیاں، خاتون مشرق، حریم اور پونم رسالوں میں چھپ چکی ہیں۔ ان کا ایک افسانہ "یادیں" کویت کا ایک اخبار "عرب ٹائمز" میں ۱۹۸۰ء میں چھپ چکا ہے۔

سعیدہ خاتون کے سترہ افسانوں کا یہ مجموعہ قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ ان کی ساری کہانیوں میں ایک رو ملتی ہے اور وہ ہے عورت پر ظلم کی اور پھر عورت کے جہاد کی۔ لگتا ہے مرد کے بارے میں ان کے ذہن میں جو تصویر بنی ہوئی ہے وہ اپنی

برتری جتانے والے کی ہے اور عورت صدمے برداشت کرنے والی نہیں بلکہ مستعدی سے مقابلہ کرنے والی ہے ۔ کہیں " تہذیب نو " اعلیٰ تعلیم اور کلب کی زندگی کی طبیعت کو واضح کیا ہے تو کہیں نئی تعلیم نے جو نئی راہیں دکھائی ہیں ۔ان کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ۔ان کا مشاہدہ ایک طرفہ نہیں ہے ۔

یہ ساری کہانیاں ستمبر ۱۹۷۹ء سے جون ۱۹۹۳ء کے درمیان لکھی ہیں ۔اس سے سعیدہ کے فن اور زبان میں ارتقاء اور نکھار کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے ۔

پھر اس طویل عرصہ میں سعیدہ نے سترہ کہانیاں ہی تو نہیں لکھی ہیں ۔ یہ سختی سے کیا ہوا انتخاب معلوم ہوتا ہے ۔اب اس انتخاب نے انھیں " رسوا " بھی کیا کہ نہیں غیر مطبوعہ کہانیاں بھی دیکھنے کو ملیں تب ہی کہا جاسکتا ہے ۔ " فریب آرزو " ارم کی دل گداز کہانی ہے ارم ایک اچھی مصور ہے اس کا اپنا مزاج ہے ،جمالیاتی ذوق ہے ۔ رشید سے شادی ہوجاتی ہے یا کردی جاتی ہے اور رشید ایک دل پھینک عاشق ہے ۔ ارم رشید میں فاصلے بڑھتے جاتے ہیں دو بچے بھی ہوتے ہیں ۔مگر ارم کے خواب چکنا چور ہوچکے ہیں ۔ " ڈھلتے ہوئے حسن " کو رشید کیوں کر اپنائے ؟ پھر ماں اور ماموں کا انتقال بھی ہوگیا ۔ارم کی نفسیاتی کیفیت غور سے تعلق رکھتی ہے ۔کہانی کچھ کہی گئی ہے اور کچھ ۔ان کہی ہے طلاق ہوگئی ممانی نے گھر سے نکال دیا ۔ارم نے فراز کو اپنا جیون ساتھی بنالیا ۔ وہ مالدار کاروباری تھا ۔لیکن شادی شدہ تھا ۔اس کی بیوی نے ہنگامہ بپا کردیا ۔ارم کباب میں ہڈی بننے کو تیار نہ تھی ۔اس نے خلع لے لی ۔

وہ پھر اسکول میں ٹیچر ہوگئی ۔یہاں چالیس سالہ نوید ہیڈ ماسٹر تھا ۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف مائل ہوتے ہیں ۔لیکن نوید بھی شادی شدہ ہے ۔اور اس کی بیوی خود کشی کرلیتی ہے ۔

کہانی میں تین عورتیں ہیں اور تین مرد ۔ارم کا اپنا ذوق ہے ۔پھر وہ شکست کھا جاتی ہے ۔اب زندگی اس کے لئے ایک ٹھیلا بن چکی ہے جیسے محض ڈھکیلا جاتا ہے ۔ دوسری عورت فراز کی بیوی ہے جو اپنے اوپر سوت لانے پر شوہر کے لئے عذاب بن جاتی ہے ۔تیسری عورت نوید کی بیوی ہے جو سوکن کو برداشت نہیں کرتی لیکن لڑتی جھگڑتی ہے ۔بے بسی کے عالم میں خود کشی کرلیتی ہے ۔پھر ایک عورت ارم کی ممانی

بھی ہے اور جو ایک بے رحم "نند" کے روپ میں آتی ہے۔

اور تین مردوں میں ایک رشید ہے جو دل پھنک اور آوارہ ہے۔ دوسرا فراز ہے جو بے بس لگتا ہے۔ تیسرا نوید ہے جو اپنے نئے عشق کے لئے بیوی کی قربانی قبول کرلیتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اب بھی ارم اور نوید خوش ہیں؟ قاری سوچنے لگتا ہے۔

"کرن" ایک ہریجن لڑکی ہے۔ گاؤں کے لالہ کا بڑا لڑکا پریم اس سے محبت کرتا ہے بلکہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ایسے میں لالہ کی لڑکی کی شادی ہوتی ہے۔ اس رات جب دلہن کی رخصتی ہوتی تو ٹھاکر کے چھوٹے لڑکے نے کرن کو دبوچ لیا۔ شادی کا وعدہ کیا اور اپنی ہوس مٹاتی اور لٹاتا ہی رہا۔

جب کرن کی ماں پر راز کھلا تب وہ حاملہ تھی۔ کرن کو ماں نے اپنی بہن کے پاس بھیج دیا۔ وہاں سے وہ بمبئی گئی اور ڈاکٹری پاس کی۔ اب کہانی کا عروج ہے۔ کرن کی چندرپور میں پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کی شادی بھی ہوچکی تھی۔ لیکن شوہر مرچکا تھا۔ ایک لڑکا سدھیر تھا۔

پریم سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ پریم دل شکستہ بھی ہے اور کرن سے ناراض بھی۔ کرن ساری کہانی سناتی ہے۔ پریم پر کیا گزرتی ہے۔ قاری قیاس کرے۔

لیکن ستم ظریفی دیکھئے کرن کا لڑکا سدھیر اس شخص کی بیٹی سے عشق کرتا ہے جس نے کرن کو تاراج کیا تھا۔

"فیصلہ" بھی ایک بہت دلچسپ کہانی ہے۔ سائرہ ایک مظلوم عورت ہے۔ اور فسادات میں اس کے بھائی مارے گئے۔ اب وہ تنہا تھی۔ اعجاز کی تصویروں کی نمائش میں سائرہ کی تصویر دیکھی تھی۔ بس تب ہی سے وہ سائرہ کی تلاش میں تھا۔ پتہ چلا کہ وہ ٹیچر ہے۔ سارے اسکول ڈھونڈ مارے۔ بالاخر سڑک پر ایک حادثے میں ایک برقعہ پوش خاتون ٹکرا کر گرپڑی۔ برقعہ الٹ گیا۔ اعجاز کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔ وہی تو سائرہ تھی۔

سائرہ اعجاز سے شادی کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ سائرہ کے والدین سے ملتا ہے اور وہ راضی ہوجاتے ہیں۔ دعوت کا اہتمام ہوتا ہے۔ لیکن اعجاز کی ماں شادی کے

خلاف تھیں۔ امیروں اور غریبوں کا کیا ناطہ؟ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگے، ممکن نہیں۔ سائرہ نے بات سن لی اور اعجاز سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اب اعجاز نے ایک خالہ زاد بہن سے شادی کر لی۔

یہ سب باتیں تو بعد میں معلوم ہوتی ہیں لیکن بعد میں شروع ایسے ہوتی ہے کہ جنید (جو اعجاز کا دوست ہے) کے گھر اعجاز آتا ہے۔ سائرہ بھی آتی ہے وہ جنید کی بیوی کی چچازاد بہن ہے۔

اعجاز اور سائرہ دونوں کو سخت حیرت ہوتی ہے پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ اعجاز جس کی شادی ہو چکی ہے اور بچے بھی ہیں، سائرہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ بچے سخت مخالفت کرتے ہیں اور صبح تک جواب مانگ کر سو جاتے ہیں۔

صبح اعجاز اپنے پلنگ پر نہیں تھا۔ اور ایک پیپرویٹ کے نیچے چٹھی رکھی ملتی ہے۔ اعجاز سائرہ کے ساتھ شادی کرنے پر اٹل ہے۔ اور بچوں کو لکھتا ہے کہ اگر تمہیں میری خوشی منظور ہے تو ۷ بجے سے پہلے دریا کے کنارے آجاؤ۔ اب صرف آدھا گھنٹہ باقی ہے۔ بچے دوڑتے ہیں۔

"فیصلہ" ظاہر ہے سائرہ سے شادی یا ندی میں ڈوب کر مرجانا اب بچوں کو فیصلہ کرنا ہے اور انھوں نے فیصلہ کر لیا باپ کی زندگی انھیں عزیز ہے۔ وہ ندی کی طرف چل پڑے۔

"انتقام" کہانی ہے ایک خود دار عورت کا جذبہ انتقام کی۔ صبیحہ ایک حسین عورت ہے اس کی شادی ڈاکٹر شفیع سے کر دی جاتی ہے۔ لیکن دونوں زندگی کو اپنے اپنے طور پر چلانا چاہتے ہے۔ ہمیشہ ان بن رہتی ہے۔ پھر طلاق ہو جاتی ہے۔ اور صبیحہ ماں کے پاس چلی جاتی ہے۔

اب صبیحہ کی دوستی سیٹھ سراج الدین کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ سراج کو ایک پڑھی لکھی سکریٹری ٹائپ کی بیوی چاہیے جو حسین بھی ہو۔ وہ کلب جاتی ہے۔ لیکن سراج چاہتا ہے کہ صبیحہ اس کے دوستوں اور کاروبار کے ساتھیوں کے ساتھ "بے تکلف" رہے۔ صبیحہ تہذیب نو کی دلدادہ ضرور تھی لیکن اس کی اپنی نسوانی انا ہے اور وہ کوئی بکاؤ مال نہیں۔

سراج کو یہ برداشت نہیں ہوتا وہ تو چاہتا ہے کہ اس کی بیوی اس کے کاروبار میں "فروغ کا واسطہ" بنے۔

سراج نے صبیحہ کو ننگا کیا۔ سگریٹ کے چرکے دیئے۔ اور ایک مچھروں بھری اندھیری کوٹھری میں بند کر دیا۔ دس گھنٹے ہوگئے۔ وہ روتی چلاتی رہی۔ پھر اپنے آپ کو مچھروں کے حوالے کر دیا۔ جب سراج آتا ہے اور کوٹھری کھولتا ہے تو صبیحہ کو باہر نکالنے پر وہ بے ہوش تھی۔ لیکن سراج جب باہر دوست سے باتیں کر رہا تھا، اس نے سن لی۔ اب وہ پاگل پن کا ناٹک کرنے لگی۔ سراج اسے پاگل خانہ میں داخل کر دیتا ہے۔ صبیحہ ڈاکٹر پر واضح کر دیتی ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے اس لئے تو یہ ناٹک بدلے کے مقصد سے رچایا تھا۔ دوسرے دن سراج کی فیکٹری جل گئی۔

آگ خود بیوی نے لگوائی تھی اب اخبار میں یہ پڑھ کر اسے بہت خوشی ہوتی ہے کہ سراج کی کمپنی جل گئی اور وہ پاگل خانے میں ہے۔

"بکھرے موتی" بھی ایک دلچسپ اور سبق آموز کہانی ہے۔ شہناز اور ممتاز بہنیں ہیں ماں، باپ اور بہنیں نئی روشنی کی دلدادہ ہیں۔ کلب جاتی ہیں لوگوں سے کھل کر ملتی ہیں۔ لیکن ماں کو اپنے وقار اور نجیب الطرفین ہونے کا۔ فخر ہے شہناز کو سلطان سے محبت ہو جاتی ہے اور وہ حاملہ بھی ہو جاتی ہے لیکن سلطان شادی سے انکار کرتا ہے اور ماں شہناز کی شادی ایک لنگڑے جوان سے کر دیتی ہے۔

اب ممتاز پر کیا گزرتی ہے؟ وہ گھر کے ملازم اعجاز کے ساتھ گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ اور ماں کے نام چھٹی چھوڑتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم دلوائی، اعلیٰ سوسائیٹی میں آنا جانا سکھایا۔ لیکن بیٹیوں کے احساسات وجذبات سے بے اعتنائی برتی اپنی دنیا ہی میں کھوتی رہیں۔۔۔۔ آپ نے راستہ دکھایا، ہم نے منزل پالی۔

نئی سوسائیٹی ہے، نیا فیشن ہے، دولت کی چہل پہل ہے۔ لیکن عورت کی محبت کو روندا جاتا ہے۔ عورت صرف ایک مرد سے محبت کر سکتی ہے۔ وہ کھلونا بننے کو تیار نہیں۔

"منزل بہاروں کی" بھی ایک دلچسپ کہانی ہے اور آج کی نئی لڑکیوں کے نئے عزائم اور حوصلوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

شاکرہ کی اچانک ملاقات فرخ سے ہوتی تھی۔اس کی گاڑی میں آدھی رات کو پٹرول کی ختم ہونے پر ایک ویران سڑک پر رک گئی تھی۔فرخ اپنی گاڑی میں سے پٹرول دیتا ہے اور پھر شاکرہ کی گاڑی کے پیچھے پیچھے اپنی گاڑی چلاتا ہوا شاکرہ کے گھر تک آتا ہے۔

پھر یہی فرخ شاکرہ کے بھائی رفیع کا ٹیوٹر بن کر روز گھر ٹیوشن پڑھانے آتا ہے شاکرہ اور فرخ میں دوستی بڑھتی ہے محبت ہو جاتی ہے۔ایک روز ماں کو شاکرہ کی جیب سے فرخ کی تصویر ملتی ہے۔وہ بہت بگڑتی ہے اس نے شاکرہ کی شادی اس کے چچازاد بھائی امجد سے طئے کر رکھی تھی۔

اب کہانی میں ایک طلسماتی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

شاکرہ اور روہنیہ میں کچھ باتیں ہوتی ہے۔

پھر یہ ہوا کہ دوسرے دن شاکرہ گر پڑتی ہے اور چلاتی ہے شاکرہ کو دواخانے میں شریک کیا گیا۔روہنیہ آتی جاتی ہے کہا گیا کہ ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے پلاسٹر چڑھا دیا جاتا ہے جب پلاسٹر نکال دیا گیا تو معلوم ہوتا ہے کہ شاکرہ لنگڑی ہو گئی ہے۔

اب لنگڑی سے کون شادی کرے امجد کے ماں باپ رشتہ توڑ دیتے ہیں۔

روہنیہ فرخ کی ماں کو شاکرہ کی ماں کے پاس لاتی ہے۔اور فرخ کی ماں فرخ کے لئے شاکرہ کا ہاتھ مانگتی ہے۔وہ مان جاتی ہے دھوکہ سے شادی ہوتی ہے۔اور دیکھا گیا کہ شاکرہ کا لنگڑا پن ختم ہو گیا ہے اور وہ دوڑتی پھرتی ماں کا ہاتھ بٹا رہی ہے۔

قاری کے ذہن میں بجلی سی چمک جاتی ہے۔شاکرہ اور روہنیہ کے حوصلے نئی نسل کے لئے پرانی نسل کی خرافات کے خلاف ایک امید کی کرن بن کر ابھرتے ہیں۔

" دائیرے " بھی عورت کے عشق کی توہین اور مرد کے نکمے پن کو ظاہر کرتی ہے۔سلطانہ کو بچپن ہی سے جمیل کے ساتھ لگاؤ تھا۔بڑی ہونے پر اور نکما پن دونوں ابھر کر آتے ہیں۔وہ سلطانہ سے عشق تو کرتا ہے لیکن جب سلطانہ کی شادی کہیں اور طئے ہوتی ہے تو وہ ایک رات جمیل کے گھر آتی ہے اور کہیں چلے جانے کی دعوت دیتی ہے جمیل بزدلی کا مظاہرہ کرتا ہے۔اس کے لئے تیار نہیں۔سلطانہ کی شادی کہیں اور کر دی جاتی ہے سات مہینے بعد بچہ ہوتا ہے جو بالکل جمیل کی " کاربن کاپی " تھا۔

اب کہانی کا دردناک موڑ دیکھئے۔ عرشی کو (جو اصل میں جمیل کا بیٹا ہے) جمیل ہی کی بیٹی سے عشق ہوجاتا ہے۔ سلطانہ دوڑی دوڑی جمیل کے پاس جاتی ہے اور یہ قصہ سناتی ہے۔ یہ بھی کہ عرشی جمیل کا بیٹا ہے۔

ایسے میں جمیل پر کیا گزرتی ہے، سعیدہ قارئین کے قیاس پر چھوڑ دیتی ہے۔

"شام غم کی قسم" راحیلہ کی کہانی ہے شادی کے ایک مہینے بعد ہی شوہر سعودی چلا گیا۔ دو سال ہوگئے۔ راحیلہ کی روتی بجتی جوانی، ظفر کی یاد میں اوپر سے زخموں پہ نمک کی طرح دونوں بھائیوں کا اپنی بیویوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہنا۔ پھر عید۔ شیر خورمہ اور جوڑے میں پھول۔ گھر سے باہر کوئی بانسری پر غم کی دھن چھیڑے ہے۔ "شام غم کی قسم۔۔۔ آبھی جا صنم"

کہانی میں سعیدہ نے بڑا جاں فشاں سماں باندھا ہے۔ راحیلہ پاگل ہوجاتی ہے اور گھر کو ظفر، ظفر، کی چیخوں سے سر پر اٹھالیا ہے۔

"ادھورے خواب" میں، ماں منظور کی شادی رعنا سے کرنا چاہتی ہے۔ وہی وقار اور سماجی مقام کا سوال ہے اور منظور کو ہاجرہ سے محبت ہے جس کا باپ ایک درزی ہے منظور کی ماں سے تند و تیز بات ہوتی ہے۔ ماں بے ہوش ہوجاتی ہے۔ دواخانے میں شریک ہے۔

یہاں ہاجرہ کی، "انا" دیکھئے۔ منظور چاہتا ہے کہ ہاجرہ دواخانے میں ماں کی دیکھ بھال کرے۔ اس سے شاید ماں کا دل پسیج جائے۔ مگر ہاجرہ انکار کردیتی ہے۔ ماں کو اس سے نفرت جو ہے۔ اس کی انا قبول نہیں کرتی۔ منظور نہیں کرتی۔ منظور خفگی کے عالم میں چلا جاتا ہے۔

اب رعنا کو دیکھئے وہ دواخانے آتی ہے۔ ماں کے نام چٹھی دے جاتی ہے کہ وہ ہاجرہ کے راستے سے ہٹ رہی ہے۔ اور ہاجرہ نے بھی رعنا کو سخت الفاظ میں خط لکھا تھا ہاجرہ کے تیور بھی قابل توجہ ہیں۔ اور رعنا کی قربانی بھی کس کس کے خواب ادھورے ہیں۔؟

"نایاب" بھی ایک ستم رسیدہ عورت اور اس کی بیٹی کی کہانی ہے۔ زیتون شوہر کے انتقال کے بعد نواب وسیم مرزا کے پاس کام کرتی ہے۔ وہ اسے اپنے گھر ڈال

لیتے ہے ۔ بیوی میکے چلی جاتی ہے ۔ نایاب پیدا ہوتی ہے ۔ نہایت حسین ۔

نواب صاحب کا انتقال ہو گیا ۔ اب زیتون اور نایاب ایک اور گھر میں کام کرنے لگتے ہیں ۔ وہیں ایک کمرے میں رہتے ہے ۔ شہناز اور ممتاز بہنیں ہیں اور ان کا ایک بھائی نواز ہے ۔ شہناز کی دھوم سے شادی ہوتی ہے اور اسی شور وغل میں نواز نایاب کو اپنے کمرے میں لاتا اور اسکی عزت لوٹ لیتا ہے ۔ پھر دونوں کے تعلقات بڑھنے لگتے ہے ۔ وہی شادی کا وعدہ ایسے میں نایاب حاملہ ہو جاتی ہے ۔ نواز کی ماں زیتون اور نایاب کو نکال دیتی ہے ۔ نایاب نواز کے پاس جاتی ہے ۔ لیکن وہ بے بس ہے ۔ نایاب کی نسوانیت چمک اٹھتی ہے ۔ وہ چلی آتی ہے ۔ ۔ نواز چپکے سے زیتون کو ایک ہزار روپے لاکر دیتا ہے ۔ نایاب کا حمل ساقط کروایا جاتا ہے ۔

پھر دیکھئے نایاب کی شادی عرب ملک کے ایک شیخ سے دایا اور صبیحہ کی سفارش پر کر دی جاتی ہے ۔ ماں بیٹی دونوں پردیس چلے جاتے ہیں شیخ کی چمکتی ہوئی بزنس ہے ۔ نایاب کو دو بچے ہوتے ہیں ۔ خوش تو ہے لیکن ایک درد پنہاں بھی ہے ۔

ایک دن کیا دیکھتی ہے کہ ہندوستان سے شیخ کے پاس کام کرنے کیلئے ایک ڈرائیور آیا ہے ۔ نایاب کو حیرت ہوتی ہیکہ وہ نواز تھا ۔ امیری کی بساط الٹ چکی تھی ۔ نایاب خوش ہوتی ہے کہ اس کے انتقام کے جذبے کی تسکین ہوئی ۔

" خزاں رسیدہ " کہانی ہی اس جملے سے شروع ہوتی ہے ۔

" زمانے کے ستائے ہوئے اور ٹھکرائے ہوئے دکھوں کے
سائے میں پلے ہوئے لوگ یا تو محبت اور خلوص کے بھوکے
ہوتے ہیں یا پھر نفرتوں اور انتقام کے جذبوں کا لاوا دل میں
چھپائے جیتے رہتے ہیں ۔ اور کچھ نہ کر سکیں تو اپنے آپ سے
بدلہ لیتے ہیں ۔ "

شاید یہی نظریہ سعیدہ کی کہانیوں کی زیریں رو بھی ہے اور اوپری لبادہ بھی ۔

نواز کے باپ نے کہا تھا کہ اس کی ماں تاروں میں کھو گئی ہے ۔ اور نواز اپنی ماں کے لیے تڑپتا رہا ۔ بی اے کا امتحان دیا ہی تھا ۔ سوچا وہ کامیاب ہو گا تو ماں ہوتی تو کتنا خوش ہوتی ۔ پھر وہ دوبئی چلا جاتا ہے ۔ وہاں اس کی ملاقات ایک عورت سے ہوتی

ہے جو اسکی ماں سے مشابہت رکھتی ہے۔
پھر دونوں ہندوستان آتے ہیں۔ نواز اس عورت کا اپنے گھر پر منتظر رہتا ہے۔ ایک دن موٹر میں یہ خاتون آہی جاتی ہے۔ فیاض اسے دھتکارتا ہے۔ نواز کھڑا دیکھ رہا ہے وہ عورت گڑ گڑاتی ہے معذرت چاہتی ہے کہ وہ ایک اسمگلر کے بہکاوے میں آکر چلی گئی تھی اور منشیات کی اسمگلنگ کرتی رہی۔ اب وہ نادم ہے۔ وہ شوہر کے سائے میں لوٹ آنا چاہتی ہے اور اپنے بیٹے کو ماں پکارتے ہوئے سننا چاہتی ہے۔ نواز ایک کونے میں کھڑا سسکیاں لیتا رہتا ہے۔

"خزاں رسیدہ" کون ہے؟ کیا فیاض فراخدلی سے کام لے گا اور اپنی بیوی کو پناہ دے گا؟ یہ سب سوال اور ان کے جواب سعیدہ قاری پر چھوڑ دیتی ہے۔

"مجرم کون؟"
بھی ایک بڑی دلچسپ اور سبق آموز کہانی ہے۔ عورت کی انا بھی ہے اور اسکی سپردگی بھی اور پھر بغاوت بھی۔

زیبا کی جلیل نواب سے شادی ہوتی ہے۔ لیکن جلیل نواب کو تو بیوی سے "اور ہی کام" لینے ہیں۔ بہانہ یہ کہ اولاد نہیں۔ زیبا سے ناروا سلوک۔ ایک روز وہ جھلس جاتی ہے۔ اب وہ "حسین" کہاں رہی؟ نواب اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے ایک بیوٹی پارلر کھول رکھا ہے۔

یہاں ایک نوجوان خوبصورت لڑکی آتی ہے۔ اس کا شوہر چاہتا ہے کہ وہ اور بھی خوبصورت بن کر پارٹی میں آئے۔ اس کے گلے میں موتیوں کا وہی ہار تھا جو جلیل نواب نے زیبا کو دیا تھا۔

اب زیبا اور اس لڑکی کی گفتگو معنی خیز بھی ہے اور لرزہ انگیز بھی۔

زیبا اپنا تجربہ بتلاتی ہے کہ مرد خود غرض ہوتا ہے اور اپنی برتری جتاتا ہے۔ اور نکہت کا تجربہ ہے کہ عورت ہی قصوروار ہوتی ہے۔ اس کی فضول خرچی شوہر کیلئے عذاب بن جاتی ہے۔ زیبا اسے بتادیتی ہے کہ جو موتیوں کا ہار نکہت نے پہن رکھا ہے وہ جلیل نواب نے زیبا کو دیا تھا اور اب وہی نکہت پہنے ہوئے تھی۔

پھر کیا ہوتا ہے؟ دوسرے دن اخبار میں زیبا پڑھتی ہے کہ نکہت نے رات ہی میں جلیں نواب کو قتل کر دیا کیوں کہ وہ نکہت کے حسن کا بیوپار کر کے بزنس میں پھیلاؤ چاہتا تھا۔ یہی اسکا پیشہ تھا۔ نکہت سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔

زیبا خوش ہوتی ہے کہ اس کا بدلہ لے لیا گیا اور قاری سوچنے لگتا ہے کہ آخر نکہت میں یہ تبدیلی کیسے آئی؟ وہ تو عورت ہی کو گھر کی ناآسودگی کی ذمہ دار ٹھیراتی تھی اور خود سپردگی کو عورت کا زیور سمجھتی تھی۔ کیا یہ زیبا کی بات چیت کا اثر ہے؟ یا پھر خود زیبا میں بھی تو نسوانیت کی پاکیزگی اور عورت کی انا چھپی ہوئی تھی۔ اسے جلیل نواب کے دھندے برے لگے اور اس نے ان کا قتل کر دیا۔

قاری پھر سے کہانی کے عنوان سے رجوع ہوتا ہے۔ مجرم کون ہے؟ مرد یا عورت جو ماں، بہن، بیوی کے روپ میں مرد کو بناتی یا بگاڑتی ہے؟۔

"پھولوں کی چبھن"

پھول کی دوستی سے بھی ہے اور ایک مجبور عورت کی کہانی بھی۔ پھول زینت اور سجاوٹ کے کام بھی آتے ہیں اور تربت پر بھی چڑھائے جاتے ہیں۔ کیا ایک مجبور عورت کے لئے پھول صرف چبھن کیلئے بنے ہیں۔

یہ ایک عورت کی کہانی ہے جو خوبصورت نہیں تھی۔ اسلئے کہیں شادی نہیں ہو رہی تھی۔ ایسے میں ایک صاحب کی بیوی مرجاتی ہے تو وہ اپنے چار بچوں کی "دیکھ بھال" کیلئے ایک ماں کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ اس لڑکی کی شادی ان سے کر دی جاتی ہے۔

اب شادی کی پہلی رات ہی اس لڑکی کو پھولوں کی چبھن کا اندازہ ہوا۔ سیج کیا تھی ایک چارپائی پر پرانی چادر بچھی تھی۔ شوہر صاحب آتے ہیں اور کہتے ہے کہ بیٹی بیمار ہے اس لئے وہ اسے ساتھ لے کر ہی سوئیں گے۔ شوہر کی "مرضی" تھی۔

بس ایسے ہی لیل و نہار گزر رہے تھے۔ اس نوجوان لڑکی کے ارمانوں اور آرزوؤں کی تربت بن چکی تھی۔ دو بچے بھی ہو جاتے ہیں۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ اس کے شوہر سینے میں درد کی شکایت سے گھر آئے بستر پر لیٹ گئے اور پھر نہ اٹھے۔ اب ان کی لاش تھی اور اس پر پھول۔ پھول بھی کیا کیا

غضب ڈھاتے ہیں و پھولوں کی اپنی کہانی بھی ہے اور قاری بھی ان کی چبھن محسوس کرنے لگتا ہے۔

" فیصلے کی رات " بھی ایک اچھی کہانی ۔ سفینہ اس کا مرکزی کردار ہے اور کہانی اسی کے اطراف گھومتی ہے ۔ سفینہ بیوہ تھی ۔ اس کی ایک لڑکی اسماء تھی ۔ اسماء کی سالگرہ ہے اور اسی رات سفینہ کو فیصلہ کرنا ہے کہ آیا وہ جاوید سے شادی کرے گی ؟ سفینہ کی کہانی یہ ہے کہ پہلے اسے رفیق کے پاس ملازمت میں وہ خود رفیق کی طرف راغب تھی ۔ لیکن اس محبت کو ایک طرف ہی رکھنا چاہا ۔ کیوں کہ رفیق شادی شدہ تھے اور ان کے بال بچے بھی تھے ۔ مگر ادھر بھی آگ سلگ چکی تھی اور ایک دن رفیق نے اس کا برملا اظہار بھی کر دیا ۔ اب سفینہ نے نوکری سے استعفیٰ دیدیا اور اپنی آگ میں خود بھی جلنے لگی ۔

پھر وہ ایک اسکول میں ملازم ہو گئی ۔ یہاں کے ڈائرکٹر حسن جاوید اس کی طرف مایل تھے اور اسماء کی سالگرہ کی رات اسے فیصلہ کرنا تھا ۔

ستم ظریفی دیکھیے رفیق بھی آدھمکے ۔ اب سفینہ اپنے بیڈروم میں بند ہو گئی ۔ اسماء ڈھونڈھتی ہوئی آئی ۔ پھر سفینہ بھی محفل میں آگئی ۔ رفیق کی طرف دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی اور بے ہوش ہو کر گر پڑی ۔

انجکشن لگایا گیا اور جب ہوش آنے لگا تو رفیق نے اپنی کہانی شروع کی ۔ ایسے میں دودھ کا گلاس لئے جاوید بھی آگیا ۔

اب سفینہ بے اختیار رو رہی تھی ۔

سفینہ ، رفیق اور جاوید کے مثلث میں کیا سبھی کے ارمانوں کا خون نہیں ہو رہا ہے یہ فیصلہ کی رات تھی ؟ کیا فیصلہ ہوا ؟ کیا ہو سکتا تھا ؟ سعیدہ نے قاری پر چھوڑ دیا ہے ۔

" پشیماں " بھی ایک اچھی کہانی ہے ۔ یہاں ثمینہ کی شادی وسیم سے کی جاتی ہے ثمینہ کے کوئی اولاد نہیں ہوتی اس لئے ماں کہتی ہے اسے ماں کے گھر بھیج دیا جائے اور وسیم اسے طلاق دیدے ۔ لیکن وسیم کو بھی کچھ چھپانا تھا ۔ اور یہ کہانی کے آخری میں ظاہر ہوتا ہے ۔

وسیم نے مجیب کو اپنی سازش میں شریک کر لیا ۔ اور علاج کے بہانے ثمینہ کو

اس کے پاس لے جاتا۔ ایک روز منصوبے کے مطابق وسیم ثمنیہ کو لینے نہیں آیا۔ مجیب نے ثمنیہ کو دوا کے نام پر شراب پلادی اور پھر اس سے لپٹ گیا۔ ایسے میں وسیم آیا اور تصویریں کھینچ لیں۔ بس پھر کیا تھا؟ ثبوت فراہم ہو گیا اور ثمنیہ اپنی ماں کے گھر بھیج دی گئی۔ طلاق بھی ہو گئی۔

ماں نے یہ شہر چھوڑ دیا۔ اور ایک دوسری جگہ رہنے لگے۔ ثمنیہ نے ایک اسکول کھول لیا اور ایک بچوں کی دیکھ بھال کا مرکز۔

ایسے میں مجیب اپنے بھانجوں کو شریک کرنے کے لئے اسکول لاتا ہے۔ اور ثمنیہ اور مجیب ایک دوسرے کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔ مجیب پھر ثمنیہ سے ملنے آتا ہے۔ پشیماں ہے۔یہاں راز کھلتا ہے کہ وسیم خود بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اور طلاق کے لئے بہانہ چاہتا تھا کہ ثمنیہ ہی بدچلن تھی اور اس سازش میں مجیب کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ مجیب نے شادی نہیں کی اور اب وہ چاہتا ہے کہ ثمنیہ اسے معاف کر دے اور اس کی بیوی بننا منظور کرے۔

یہاں لگتا ہے کہ پشیماں مجیب ہی نہیں بلکہ سعیدہ بات قاری پر چھوڑ دیتی ہے کہ وسیم کے بارے میں وہ خود کوئی رائے قائم کرے۔ کیا اسے صرف پشیماں کیا جائے گا؟ غرض سعیدہ کی کہانیوں کا یہ مجموعہ اپنی جگہ اہم ہے اور سماج کی ایک دکھتی رگ کو سعیدہ نے اپنی گرفت میں لیا ہے۔ کہانیوں میں روانی بھی ہے اور کہیں کہیں نفسیاتی جائزہ بھی چل جاتا ہے یا قاری کو اسکے اشارے ملتے ہیں۔

کہانی اکثر ایسے ختم ہوتی ہے کہ قاری کچھ دیر کے لئے سوچنے لگتا ہے کہ کیا ہوا؟ کیوں کر ہوا؟ کیا ہونا چاہیئے تھا؟ کہانیاں چغلی کھاتی ہیں کہ سعیدہ کے پاس اس کے خود کار آفرین ہند ہے جیسے جہاں بانو نقوی جیسی معلمہ، محفل خواتین جیسے ادارے اور خود اس کے بھائیوں کے ادبی ذوق نے جلا دی ہے۔

قاری کو امیدیں باقی ہیں کہ سعیدہ کا ادبی سفر جاری رہے گا اور بھی کہانیاں پڑھنے کو ملیں گی۔

ایک بات ضرور محسوس ہوتی ہے کہ متعدد کہانیوں کا مرکزی خیال اور ملاوٹ کا مرکزی نقطہ ایک ہی ہے ذرا سی تبدیلی سے کہانیوں میں فرق و امتیاز پیدا کیا

گیا ہے۔ لیکن آثار بتلاتے ہیں کہ سعیدہ کی ادبی تخلیق میں ماحول کی کربناک حقیقتوں کے ساتھ اس کی اپنی زندگی کی تلخیوں اور ناآسودگیوں کا امتزاج ہوا ہے۔ اور یہی وہ راز ہے جو اس سے اور بھی بہت کہانیاں لکھوائے گا۔

راج بہادر گوڑ

نایاب

انیس افسانے

افروز سعیدہ

رفعتوں پر وہی پہنچتے ہیں
رکھتے ہیں جو اپنے حوصلے بلند
وہ بھی انسان ہیں جو دھرتی سے
چاند تاروں پر ڈالتے ہیں کمند

وہ وہاں کی کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنے وطن سے دور جا بسے ایسی جگہ جہاں خود غرض لوگ نہ ہوں جہاں مذہب کی افراتفری نہ ہو غربت اور گندگی نہ ہو علم و ہنر کی قدر کی جاتی ہو انسانیت ہو محبت ہو۔

تکمیل آرزو

اماں کے بار ہا ٹوکنے کے باوجود شہباز نے بیگم زمانی کے ہاں جانا نہیں چھوڑا تھا۔ گیارہ بارہ سال کے شہباز کو بیگم زمانی کا گھر عجائب گھر لگتا تھا جہاں ہر وقت ہلہ گلہ رہتا۔ ان کے شوہر 10 سال سے ہندوستان سے باہر تھے ادھر ان کی بیگم ہر روز محفلیں سجاتیں ہر روز نیا پکوان ہوتا اور یار دوست خوب گلچھرے اڑاتے۔ گھر کے کمپاؤنڈ میں خوبصورت چمن تھا جہاں بچوں کے دلچسپی کے سامان تھے۔ شہباز کو وہ سودا سلف لانے کے لئے اوپر سے آواز دیتیں اور وہ دوڑتا ہوا چلا جاتا گھر میں داخل ہوتے ہی وہ سحر زدہ سا ہو جاتا چمن میں لگے جھولوں کو دیکھتا تو کبھی چھوٹی سی لائبریری میں سجی بچوں کی کومکس دیکھتا لائبریری کے ایک کونے میں رکھے اکویریم نے اسے ہمیشہ مجبور کیا کہ وہ بھاگتی دوڑتی رنگ برنگی مچھلیوں کو ضرور دیکھے۔ جب ڈرائینگ روم میں جاتا تو ایک ایک ڈیکوریشن پیس کو للچائی نظروں سے دیکھتا رہتا۔ موقعہ ملنے پر بیگم زمانی سے پوچھتا کہ یہ کیا ہے وہ کیا ہے یہ چیز کہاں سے لائی گئی کس نے لائی اور کب لائی۔ بیگم زمانی جواب دیتیں کہ یہ چیز دوبئی سے آئی ہے یہ سعودی سے منگوائی ہے اور یہ سنگاپور سے فلاں انکل نے لاکر دی ہے۔ بیگم زمانی کی رنگین قیمتی ساڑیوں سے بکھرتی خوشبو سے وہ بے حد متاثر تھا یہی سب کچھ دیکھنے اور سننے کے لئے وہ ان کی آواز پر دوڑ جاتا۔ قدرت کسی کا دامن امیری کے پھولوں سے بھر دیتی ہے تو کسی کے دامن میں غریبی کے کانٹوں کا جنگل اگا دیتی ہے شہباز ہر روز ارادہ کرتا کہ وہ بھی ایک دن ایسا ہی خوبصورت مکان بنوائے گا اسی طرح خوب سجائے گا اور ماں کو ایسی ہی خوشبو دار ساڑیاں لاکر دے گا لیکن اس کا ننھا سا ذہن یہ سوچ کر مایوس ہو جاتا کہ یہ سب کچھ کب اور کیسے ہوگا ہم تو بہت غریب ہیں دو وقت کی روٹی پیٹ بھر نہیں کھا سکتے خالہ اور ماموں بہت امیر لوگ ہیں وہ ہمیں بھی اپنی خوشیوں میں کیوں شامل نہیں کر لیتے شاید ہماری غریبی کی وجہ سے ہمارے گھر بھی نہیں آتے۔ بیگم زمانی کے پاس ہر روز کتنے لوگ چم چم کرتی کاروں میں آتے ہیں کچن سے اچھے اچھے کھانوں کی خوشبو آتی ہے اور سب مل کر خوب مذاکرتے ہیں۔ اس کا کچا ذہن ان باتوں کی گہرائی

کو نہیں ناپ سکتا تھا۔ وہ ہر روز اپنے ارادہ کو مضبوط بناتا کہ وہ بھی ایک دن بڑا آدمی بنے گا اور اپنے جیسے غریبوں کی مدد بھی کرے گا۔

شہباز سنگاپور کی ایک انتہائی خوبصورت جگہ سنتوسا آئی لینڈ کے ایک پرسکون کونے میں بیٹھا ہوا زندگی کے پچھلے دنوں کی یاد تازہ کر رہا تھا اس کے ماموں کو شاید ان کی غریبی پر ترس آ گیا تھا انہوں نے اسے سعودی بلوا لیا تھا وہ خوش تھا کہ ماموں کی طرح وہ بھی دولت کمائے گا۔ ابھی دو سال نہیں گزرے تھے کہ اس کا کفیل مر گیا اسے ماموں کے ساتھ وطن واپس آنا پڑا۔ سعودی میں گزارا ہوا مختصر عرصہ اسے ایک صدی کے برابر لگا تھا ہر روز سولہ گھنٹے کی محنت اور تنخواہ کم! جس میں سے وہ کچھ ماں کو بھیج دیتا اور کچھ جمع کر لیتا۔ اس کی ماں اسکول میں ٹیچر تھی اور بڑا بھائی پڑھ رہا تھا وہ بھائی کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتا تھا۔ وطن آنے کے بعد وہ بچائی ہوئی رقم سے سنگاپور آ گیا۔ چنگی ایرپورٹ پر اترنے کے بعد اس نے زندگی کا ایک نیا روپ اور نکھار دیکھا ایرپورٹ کی خوبصورتی اور سجاوٹ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ایرپورٹ کیا تھا ایک چمن زار تھا ہر طرف رنگ برنگی پھولوں کی بہار تھی۔ بلڈنگ کے اندر داخل ہونے کے بعد سامنے والی دیوار سے لگے ہوئے کئی اکویریمس رکھے تھے جن میں ہمہ اقسام کی انوکھی مچھلیاں قدرت کی صناعی کا نمونہ پیش کر رہی تھیں بلڈنگ کی چھت سے چھوٹے چھوٹے آبشار گر رہے تھے عجیب سحر انگیز ماحول تھا۔ یہاں زندگی چل نہیں رہی تھی بلکہ رنگین فضاؤں میں اڑ رہی تھی۔ مستقبل کے بے شمار سہانے خواب پلکوں میں چھپائے وہ تلاش معاش میں لگ گیا۔ بڑی مشکل سے ایک موٹر بوٹ پر کام مل گیا اس موٹر بوٹ کو "فیری" کہا جاتا ہے یہ فیریز انڈونیشیا کے ایک جزیرے باتام اور سنگاپور کے درمیان مسافروں کو اور سامان لانے لے جانے کے لئے چلائی جاتی ہیں۔ اسے سنگاپور آئے ہوئے دو سال ہو گئے تھے اس نے یہاں زیادہ نہیں کمایا تھا گزر اوقات کے بعد تھوڑی بہت بچت ضرور کر لیتا تھا۔ وہ یہاں خوب صحت مند ہو گیا اور بہت ہی خوبرو لگتا تھا۔ وہ اس سال عید پر وطن جانا چاہتا تھا ماں اور بھائی کے لئے کچھ سامان خریدنے کے ارادے سے سیرنگ گون روڈ پر ایک شاپنگ سنٹر میں گیا۔ کچھ دیر دوکان کی سجاوٹ اور خوبصورت چیزوں کو دیکھتا رہا۔ قیمتی اور خوش رنگ اسکرٹس میں

ملبوس خوش اخلاق سیلز گرلس اس کی حیرانی کو حیرانی سے دیکھ رہی تھیں وہ جھینپ سا گیا۔اور مسکراتے ہوئے ایک کاؤنٹر کی طرف بڑھا سیلز گرل نے ذرا سا جھک کر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ خیر مقدم کیا۔وہ ڈر رہا تھا کہ اتنی قیمتی چیزیں خریدنے کی اجازت اس کی جیب دے گی یا نہیں؟ اس کے پاس صرف دو ہزار ڈالر تھے۔اس نے ایک ساڑی کی قیمت پوچھی جو اسے بہت پسند آئی تھی اس کی قیمت 150 ڈالر بتائی گئی اس نے دو تین ساڑیاں اور بھائی کے لئے بھی کپڑے اور کچھ ڈیکوریشن پیسس لیکر سیلز گرل کا شکریہ ادا کرکے واپس ہو رہا تھا کہ اس نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا نام نورعین بتایا اور پوچھا کہ کیا وہ ہندوستانی ہے اور یہ چیزیں کس کے لئے خریدی ہیں شہباز نے خوش اخلاقی اور مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور اپنا نام بھی بتایا۔سیلز گرل نے معافی چاہتے ہوئے اس سے کل آنے کی التجا کی شہباز نے اثبات میں گردن ہلائی۔وہ وہاں کی کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنے وطن سے دور جا بسے ایسی جگہ جہاں خود غرض لوگ نہ ہوں جہاں مذہب کی افراتفری نہ ہو غربت اور گندگی نہ ہو جہاں علم و ہنر کی قدر کی جاتی ہو محبت ہو انسانیت ہو راستہ بھر وہ ان ہی خیالوں میں الجھتا سوچتا رہا کہ آخر اس نے کیوں بلایا ہے۔

دوسرے دن وہ اسی سوال کو دہراتا دھڑکنوں کو سنبھالتا ہوا اسی شاپنگ سنٹر کی طرف چل پڑا۔اس نے دور ہی سے دیکھا کہ کل والے کاؤنٹر پر نورعین کی بجائے کوئی اور لڑکی تھی اس نے جھجکتے ہوئے نورعین کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس کی بہن کی لڑکی بہت بیمار ہے اسی کو دیکھنے وہ چھٹی پر گئی ہوئی ہے شہباز بجھے ہوئے دل کے ساتھ واپس ہو گیا اس کے جانے میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا نورعین کی التجا کرتی ہوئی آنکھوں میں کیا بات تھی کہ وہ اس سے ملے بغیر جانا نہیں چاہتا تھا۔لیکن اس سے کس طرح مل سکتا تھا پتہ نہیں وہ باتام میں کہاں رہتی ہے شاپنگ سنٹر سے اس کا پتہ حاصل کرنا مناسب نہیں تھا۔ان ہی سوچوں میں وہ کھویا کھویا سا رہتا کام پر بھی دل نہیں لگتا تھا کام تو کرنا تھا وہ ہر روز فیریز کے ذریعہ باتام سے آنے والوں کو دیکھتا رہتا اور سوچتا کہ شاید نورعین بھی کسی فیری سے واپس آجائے۔اسی دوران ایک چاندنی رات میں وہ کنارے کے ایک ریسٹوران میں بیٹھا ہوا سمندر کی اونچی اٹھتی ہوئی

لہروں کو دیکھ رہا تھا جو ساحل سے ملنے کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش کر رہی تھیں آج وہ بہت تھک گیا تھا 11 بج چکے تھے وہ گھر واپس جانا چاہتا تھا کہ کراہنے کی مردانہ آواز پر چونک پڑا۔ قریب کے بنچ پر گرے کلر کے قیمتی سوٹ میں ایک ادھیڑ عمر شخص سوٹ کیس تھامے بیٹھا تھا۔ وہ کوئی تاجر معلوم ہوتا تھا۔ شہباز اس کے قریب گیا اور پوچھا۔

"جناب آپ کو کہاں جانا ہے"؟

"بیٹا مجھے باتام جانا ہے کیا کسی فیری کا انتظام ہو سکتا ہے"؟

"میں آپ کو باتام پہنچا سکتا ہوں"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے"۔ چلو

شہباز نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا فیری میں بٹھاکر سوٹ کیس اٹھالایا اور اس کے قریب رکھ دیا فیری چل پڑی۔ کچھ دیر بعد شہباز نے پوچھا۔

کیا آپ کو لینے کے لئے گھر والے نہیں آئے؟

آپ کو تیز بخار ہے آپ کہاں سے آرہے ہیں؟

"میں گزشتہ چودہ سال سے افریقہ میں تھا جہاں میرا وسیع کاروبار ہے چند مہینوں سے بیمار ہوں اب اپنے وطن میں آرام کرنے کا ارادہ ہے! گھر والوں کو اطلاع نہیں دی تھی۔

"کیا آپ باتام میں ہی رہتے ہیں"؟

"ہاں وہاں میرا گھر ہے جو نور ولا کے نام سے جانا جاتا ہے"۔ "تم ہندوستانی معلوم ہوتے ہو یہاں کیا کرتے ہو"؟

"جی! آپ کا خیال ٹھیک ہے میں ہندوستانی ہوں اور کسی اچھی ملازمت کے لیے کوشش کر رہا ہوں دو سال پہلے سنگاپور آیا تھا۔ اس فیری کے مالک نے مجھے کام دیا ہے لیکن یہ مجھے پسند نہیں ہے"۔

"تم نے میرے ساتھ بڑی ہمدردی کی ہے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی"۔ "جی یہ تو میرا فرض تھا"

کنارا قریب آرہا تھا دونوں خاموش ہوگئے۔ شہباز نے اسے سہارا دے کر اتارا اور

ٹیکسی میں بٹھا کر واپس ہو گیا۔ وہ فیری کو اس کے مقام پر رکھ کر واپس ہونے لگا تو اچانک اس کی نظر فیری میں پڑے ہوئے چھوٹے سے ہینڈ بیگ پر پڑی اس نے ہاتھ میں لے کر دیکھا تو اس پر ثاقب عبداللہ نورولا لکھا تھا۔ دوسرے دن اس نے فیری نکالی اور باتام روانہ ہو گیا۔ پتہ نکالنے میں اسے دشواری نہیں ہوئی دروازہ پر لگی ہوئی کال بیل کا بٹن دبایا یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ دروازہ کھولنے والی نورعین تھی چند لمحوں تک دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر نورعین نے کہا "آپ! آپ شہباز ہیں نا؟

"ہاں میں شہباز ہوں نورعین"

"آیئے آیئے! آپ کو مکان کا پتہ کس طرح ملا؟

"تشریف رکھیں" شہباز نے بیٹھتے ہوئے کہا "دراصل میں یہ ہینڈ بیگ دینے کے لئے آیا ہوں رات ایک صاحب میری فیری کے ذریعہ سنگاپور سے یہاں آئے ہیں"۔

"اوہ! وہ میرے والد ہیں میں ابھی اطلاع کرتی ہوں رات انہیں شدید بخار تھا دس سال پہلے وہ ہمیں چھوڑ کر افریقہ چلے گئے اور اپنی دوسری بیوی کے ساتھ رہتے تھے۔ اچھا یہ بتائیں آپ اپنے وطن کب جا رہے ہیں"؟

"مجھے چار دن پہلے ہی جانا تھا لیکن میں آپ سے ملنے کے بعد ہی جانا چاہتا تھا"

"میں آپ سے معافی چاہتی ہوں کہ آپ سے مل کر نہ جا سکی میری ماں نے ریشمی کی بیماری کی وجہ سے فون کیا تھا جس دن آپ کو آنا تھا اسی دن میں چلی گئی تھی آپ کا پتہ تو نہیں تھا کہ اطلاع کر کے جاتی"۔

"دراصل آپ کے بلانے اور نہ ملنے پر میں حیران تھا"۔

"آپ کی حیرانی واجبی ہے ایک اجنبی شہر میں اجنبی لڑکی نے آپ کو بلایا تھا۔ ایک بات بتاؤں کہ آپ مجھے اجنبی نہیں لگے تھے بلکہ آپ کو دیکھنے کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے کھوئی ہوئی کوئی چیز مل گئی ہو۔ شہباز آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ میرے مرحوم بہنوئی سے آپ کی شکل بہت ملتی جلتی ہے وہ بھی ہندوستانی تھے ان کی لڑکی ریشمی مجھے اپنی ممی سمجھتی ہے میں آپ کو اس سے ملانا چاہتی تھی" نورعین خاموش ہو گئی

"تمہاری بہن کہاں ہیں"؟

"بہن اور بہنوئی کا ایک حادثہ میں انتقال ہو گیا" ۔ "ریشمی اکثر اس کے پاپا کی تصویر سے باتیں کرتی اور انہیں جلد آنے کے لئے کہتی رہتی ہے" ۔

"کیا میں اس کا پاپا نہیں بن سکتا" ؟

نورعین نے شرما کر گردن جھکا لی اور والد کو بلانے کے لئے اٹھ کر چلی گئی چند منٹ بعد ان کے ساتھ واپس آئی ۔ شہباز سلام کرتا ہوا کھڑا ہو گیا اور ہینڈ بیگ والا ہاتھ آگے بڑھا دیا ۔

"اوہ یہ ہینڈ بیگ کہاں سے ملا تم کون ہو" ؟

رات میں نے آپ کو سنگا پور سے باتام لایا تھا یہ بیگ مجھے فیری میں پڑا ملا تھا ۔ نورعین کے والد کبھی بیگ کو اور کبھی شہباز کو دیکھ رہے تھے پھر کہا ۔

"کیا تم جانتے ہو اس بیگ میں کیا ہے" ؟

"جی ہاں! میں جانتا ہوں! شہباز نے دبی زبان سے کہا ۔

"یہ دیکھو! دیکھو اس میں لاکھوں روپئے کے ہیرے ہیں رات نیم بے ہوشی کی حالت میں مجھے اس کا خیال ہی نہیں رہا نور نے مجھے ابھی جگایا ہے ۔

"حیرت ہے کہ تم نے ان ہیروں کو دیکھا اور واپس کرنے چلے آئے" ۔

"جی ہاں یہ تو میرا فرض تھا میں نے ہمیشہ لمان کی روشنی میں راستہ چلنے کی کوشش کی ہے اور اسی نور نے آپ کے نور ولا تک میری رہنمائی کی ہے" ۔

"آج میں بہت خوش ہوں بیٹا! کاش تمہارے جیسا ایک بیٹا میرا بھی ہوتا یہ لو میری طرف سے دو ہیرے تم رکھ لو" ۔ "آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں جناب میں نے تو اپنا فرض ادا کیا ہے" ۔

"دیکھو انکار نہ کرنا میں تمہیں اپنا بیٹا سمجھ کر دے رہا ہوں یہ تمہارے بہت کام آئیں گے ، رکھ لو" ۔

شہباز کبھی ہیروں کو اور کبھی نورعین کے والد کو دیکھ رہا تھا تب تک نورعین نے ناشتہ لگا دیا اور شہباز کو مخاطب کیا ۔

"چلئے شہباز آپ رات کے تھکے ماندے ہیں صبح سے بھی کچھ کھایا پیا نہیں ہو گا" ۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے تم دونوں پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہو" ۔ "جی ہاں آپ کا

خیال غلط نہیں ہے" ناشتہ کے دوران نورعین نے ان کی پہلی ملاقات کے بارے میں بتایا تب ثاقب عبداللہ نے شہباز کے خاندان اور مستقبل کے پروگرام کے بارے میں پوچھا پھر کہا" بیٹا کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ یہاں رہو کوئی کاروبار کرو، میں تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں" محبتوں اور عنایتوں کی بارش میں شہباز بھیگ گیا۔ دوسرے دن نورعین نے جلد آنے کا وعدہ لے کر اشک بار آنکھوں سے شہباز کو رخصت کیا۔

نادان

امجد عارفی کی پینٹنگز نمائش کے لئے رکھی گئی تھی آرٹ گیلری شہر سے کچھ دور تھی ۔ مسعود آج بہت اداس تھا اور چھٹی کے دن اس کے لئے نمائش جانے سے بہتر کوئی اور مشغلہ نہیں تھا ۔ شام 6 بجے وہ ٹہلتا ہوا پیدل ہی چل پڑا ۔ موسم اچھا تھا ٹھنڈی ہوائیں جیسے کوئی پیغام دے رہی تھیں لیکن اس کی اکیلی زندگی میں کوئی پیغام کہاں سے آتا ۔ آرٹ گیلری کے اندر وہ ایک ایک تصویر کو غور سے دیکھتا رہا اور مونالزا کی تصویر کے آگے جسم سا گیا روبینہ کی مسکراہٹ بڑی حد تک مونالزا کی مسکراہٹ سے ملتی جلتی تھی روبینہ خوبصورت تھی اس کی بیوی تھی اور اس کے دو بچوں کی ماں بھی تھی لیکن امیر باپ کی بد دماغ لڑکی نے اسے ذہنی اذیت دی تھی ۔ مسعود کی نظریں مونالزا کی تصویر پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اپنے ماضی میں کھویا ہوا تھا ۔ روبینہ بہت دور سے اس کے پاس آئی تھی لیکن کبھی اس کے دل کے قریب نہ آسکی ۔ اس نے پہلے بچے کی پیدائش کے بعد ہی سے الگ گھر بسانے کی ضد لگا رکھی تھی کہ بیس لاکھ کے صرفہ سے بنایا ہوا نیا مکان اس کے نام کر دیا جائے ۔ مسعود نہیں چاہتا تھا کہ اس کی اپنی ذات سے والدین کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے اس نے بار بار روبی کو سمجھایا کہ وہ ایک تعلیم یافتہ اور مہذب لڑکی ہے ۔ اس طرح کی ضد نہیں کرنی چاہیے رشتے دار اور محلے والے اس پر انگلیاں اٹھائیں گے والدین کی موجودگی میں مکان اس کے نام کر دینا کوئی اچھی بات نہیں ہے اس کی جلدی بھی کیا ہے ابھی تو زندگی پڑی ہے شوہر کا اعتماد حاصل کرنا دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے اس سچائی کو حاصل کرنے کے بعد شوہر کی ہر چیز پر اس کا اختیار ہوتا ہے اور بڑوں کی دعاؤں کے سائے میں جو زندگی گذرتی ہے اکیلی زندگی سے کہیں بہتر ہوتی ہے اور اس کی ماں ایک اعلیٰ خاندان کی تعلیم یافتہ اور باوقار خاتون تھی جس نے ہمیشہ اپنی اولاد کی خوشی میں اپنی خوشی ملحوظ رکھی تھی بچوں کے ذاتی معاملات میں وہ دخل نہیں دیتی تھیں پھر روبی کی ضد کہاں تک واجبی تھی جب کہ رہنے کے لئے کافی بڑا ذاتی مکان اور مکان میں ہر طرح کی آسائش نوکر چاکر موٹر ڈرائیور سبھی کچھ تھا ۔ والدین کی پسند اور خوشی کا لحاظ رکھتے ہوئے مسعود نے

نبھانے کی پوری کوشش کی تھی لیکن روبینہ نے اپنی ہٹ نہیں چھوڑی اور دونوں بچوں کو چھوڑ کر چلی گئی۔ مسعود کے خیالات کا تسلسل اس وقت ٹوٹا جب ایک چھوٹا سا لڑکا جو اپنی ماں کی انگلی تھامے ہوئے تھے اس سے ٹکرا کر گر پڑا تھا۔ مسعود نے جھک کر فوراً اسے اٹھانے کی کوشش کی اسی وقت اس کی ماں نے اسے گود میں لے لیا مسعود نے معافی چاہتے ہوئے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا وہ ایک 30 سالہ اینگلو انڈین خاتون تھی اس نے بھی مسکرا کر معافی چاہا اور آگے بڑھ گئی۔ مسعود کو پپو اور گڈی یاد آنے لگے ۔۔ روبینہ کے گھر چھوڑ کر جانے کے چند دن بعد شاید اس کی ضد کا طلسم ٹوٹا تو اپنی خالہ کا سہارا لیا۔ خالہ اسے اپنے ساتھ لائیں اور کہا تھا کہ شوہر کا گھر چھوڑ کر جانا اس کی نادانی تھی اسے ایک موقع دیا جائے وہ شکست خوردہ سی کھڑی تھی تب مسعود کی ماں نے کہا کہ یہ تمہارے والد محترم کی سلطنت تو نہیں تھی کہ من مانے حکومت کرتیں عورت کا ظرف تو بہت بڑا ہونا چاہیے اور تم ایک کم ظرف عورت ہو چلی جاؤ یہاں سے شاید کوئی خاص چیز بھول گئیں کیا وہی لینے آئی ہو ؟ بچوں نے یہ کہکر اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا کہ ممی ہمیں پکڑ کر لے جائیں گی ہم دادا دادی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ مسعود نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور آرٹ گیلری سے باہر نکل گیا۔ اینگلو انڈین خاتون اور اس کا بچہ آہستہ آہستہ جاتے ہوئے نظر آئے۔ مسعود اپنے آپ کو ایک ایسا اپاہج محسوس کر رہا تھا جس کی لاٹھی کھینچ لی گئی ہو طبیعت کا بوجھل پن ہٹانے کے لئے اس نے خوبصورت معصوم سے بچے کو چھیڑا۔ اور اس کی ماں نے ہیلو کیا۔ وہی مسکراہٹ وہی سادگی جو ایک عورت کا زیور ہونا چاہیے جسے وہ پسند کرتا تھا مسعود کو عورت ذات سے نفرت سی ہو گئی تھی اس نے شیبا کی مسکراہٹ کو نظرانداز کر دیا تھا اس سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن وہ اتنی بااخلاق شیریں زبان اور پرخلوص شخصیت کی مالک تھی کہ مسعود مجبور ہو گیا اور یہ ملاقات دوستی میں بدلتے دیر نہ لگی مسعود کی مردہ زندگی انگڑائیاں لینے لگی۔ کبھی تنہا بیٹھا ہوا شیبا اور روبینہ کا موازنہ کرتا تو شیبا ایک آسمانی حور معلوم ہوتی اس کے سلوک میں نشہ اور مٹھاس تھی اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی ہوش ربا تجربہ سے گزر رہا ہو شیبا کی ماں ایک ہندوستانی عورت تھی اور باپ انگریز تھا۔ اسکا شوہر

پائلٹ تھا جو ایک ہوائی حادثہ کا شکار ہو چکا تھا۔ شیبا بے حد سلیقہ مند تھی اس نے چند ہی دنوں میں مسعود کے گھر کو نئی رونق بخشی تھی صاف ستھرے گھر میں قرینے سے رکھی ہوئی ہر چیز اسے آسودگی کا احساس دلا رہی تھی ایک عورت روبینہ بھی تھی جس نے کبھی گھر کے کام میں کوئی دلچسپی لی، نہ ہی کبھی بچوں کا خیال رکھا تھا کسی گھر یا قوم کے مستقبل کو سنوارنے میں عورت کے ہاتھ کتنی اہمیت رکھتے ہیں مسعود پر عیاں ہو چکا تھا۔ وہ دن بہ دن شیبا سے قریب تر ہو رہا تھا۔ ایک دن باتوں میں شیبا نے اس بات کا اظہار کر دیا تھا کہ مذہب کی آہنی دیوار کو گرا دینا چاہتی ہے اور اسے اپنی زندگی کا سہارا بنانا چاہتی ہے۔ اسی دوران مسعود کی ماں کا خط آیا کہ وہ اس کے لئے کسی اچھے خاندان کی شریف لڑکی سے سلسلہ، پیام چلا رہی ہیں اور وہ کچھ دن کے لئے آجائے کیونکہ اس کے والد کا آپریشن بھی ہونے والا تھا والد کے آپریشن سے ایک دن پہلے اس کی چھوٹی پھوپی روبینہ کے ساتھ دواخانہ آئیں اور اپنے یعنی مسعود کے والد کے پیر پکڑ کر معافی چاہی کہ انہوں نے اپنے ہی بھائی کی اولاد کا گھر اجاڑا تھا روبینہ اور اس کی والدہ کو ان کے خلاف بھڑکایا، مسعود وہیں موجود تھا پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی یہ پھوپی شوہر کی ٹھکرائی ہوئی ایسی عورت تھی جسے کسی کا بسا بسایا گھر اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا وہ ہر وقت کسی نہ کسی کی ٹوہ میں رہتی اور اپنے حسد کے تیروں کا نشانہ بنانے کے دھن میں رہتی تھی اس نے بھائی سے التجا کی کہ وہ روبینہ کو معاف کر دیں اور موقع دیں کہ وہ اپنی اجڑی زندگی کو سنوار سکے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وقت بہت آگے نکل چکا ہے اور مسعود بھی وقت کے ساتھ اتنی دور جا چکا ہے اس کا لوٹنا اب ممکن نہیں تھا۔

نایاب

خدا پوچھے گا محشر میں بتا تقصیر کس کی ہے
تو کہہ دونگا میری تقدیر میں تحریر کس کی ہے

یہ روپئے آپ اپنے ہی پاس رکھیں نواز صاحب ہم غریب ضرور ہیں لیکن بکاؤ نہیں ہیں تم نے میرے جذبات کے ساتھ کھیلا ہے میری عزت وجوانی کو پامال کیا ہے ان سفید کپڑوں کے نیچے تم نے ایک سیاہ دل چھپا رکھا ہے تم ایک گرے ہوئے انسان ہو تمہیں ایک دن پچھتانا پڑے گا۔

آج نایاب بھاگ بھاگ کر سارے کام نپٹا رہی تھی اس کے پیروں میں جیسے پھر کیاں لگ گئی تھیں اس نے بھی زرق برق لباس پہنا تھا اس کی مالکن شہناز کی شادی تھی گھر مہمانوں سے بھرا تھا خوشیوں اور خوشبوؤں سے فضاء مہک رہی تھی۔ بارہ تیرہ سال کی نایاب اس عمر کی تمام ہی لڑکیوں میں منفرد سی لگ رہی تھی حسن اس کے روں روں سے چھلکا پڑ رہا تھا وہ تھی تو ایک نوکرانی زیتون کی بیٹی لیکن چہرہ پر امیر زادیوں جیسا رعب بڑا عجیب تھا۔ زیتون بھی دیکھنے میں بہت اچھی تھی شوہر کے انتقال کے بعد ایک بگڑے نواب وسیم مرزا نے اسے اپنے گھر ڈال لیا تھا۔ مرزا کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی محض اس لئے کہ وہ ترچھا دیکھتا تھا۔ زیتون کو اس نے ڈوبتے کا سہارا سمجھا بڑے پیار سے اپنے پاس رکھا وہ ٹی۔ بی کا مریض ہو گیا تھا اور ملازمت ترک کر دی تھی۔ زیتون کا بھی دنیا میں کوئی نہیں تھا وہ مرزا کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتی تھی۔ اسی دوران نایاب پیدا ہوئی۔ دواخانہ کا عملہ اس حسین گڑیا کو دیکھ انگشت بدنداں رہ گیا اور نواب وسیم مرزا نے اس کا نام نایاب رکھ دیا۔ مرزا کی موت کے بعد محلے والوں نے از راہ ہمدردی اس کا وظیفہ زیتون کے نام کروا دیا۔ دو کمروں والا کچا مکان مرزا نے اپنی زندگی میں نایاب کے نام کر دیا تھا۔ ایک سو بیس روپیے میں ماں بیٹی کا گزارا ناممکن تھا اس لئے زیتون ایک دولت مند کے گھر نوکری کرنے لگی نایاب اسکول میں پڑھ رہی تھی ساتویں جماعت تک پڑھنے کے بعد اسے اسکول چھوڑنا پڑا کیونکہ اس بڑے گھر کا کام اکیلی ماں سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ ان لوگوں نے ماں بیٹی کو رہنے کے لئے ایک کمرہ دے دیا تو زیتون نے اپنے گھر کو قفل لگا دیا کچھ پیسے جمع ہونے کے بعد اس نے دونوں کمروں کے اطراف پتھر کی چار دیواری اٹھوا دی اس طرح اپنے مرحوم شوہر کی نشانی اور نایاب کی امانت کو محفوظ کر دیا۔ نایاب کو جو بھی چھوٹا بڑا کام دیا جاتا وہ منٹوں میں سلیقہ کے ساتھ کر دیتی اسے پڑھنے کا بھی شوق تھا گھر کے کام میں ماں کا ہاتھ بٹانے کے بعد وہ شہناز کی چھوٹی بہن ممتاز کے ساتھ بیٹھی لکھتی پڑھتی رہتی۔ شہناز نے میٹرک پاس کر لیا بڑے باپ کی بیٹی تھی آج اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہو رہی تھی۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ دلہن کا حسن بھی نایاب کے آگے ماند پڑ گیا تھا اس کے رخساروں کی ہڈیاں سرخ و سفید گوشت کی

تہوں میں چھپ گئی تھیں بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں ہونٹ رس بھرے انگور لگتے تھے اور سپاٹ جسم پر جیسے انار اگ آئے تھے ۔ غریب کے گھر جوانی دبے پاؤں آتی ہے اور آنے کے بعد بڑا شور مچاتی ہے ۔ شہناز اور ممتاز کا ایک بھائی نواز بھی تھا جو اکثر نایاب کو چھیڑتا ستاتا رہتا آج نایاب کے حسن جہاں سوز کو دیکھ کر وہ بھی ٹھٹک گیا تھا دن بھر میں کئی بار اس کے چٹکی کاٹتا رہا اور نایاب اس سے بچنے کی کوشش کرتی رہی ۔ رات بارہ بجے کے قریب دلہن کی رخصتی ہوئی تو سب تھکے ہارے لوگ ادھر ادھر پڑ کر سو رہے لیکن نواز نایاب کی تاک میں تھا نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی جب اس نے اطمینان کر لیا کہ سب بے خبر سو چکے ہیں وہ اٹھا اور دیکھا کہ دالان کے ایک سرے پر نایاب بھی چاروں خانے چت سو رہی تھی وہ بھی اس کے بازو لیٹ گیا اور اسے جگانے لگا جب اس نے کروٹ بدلی تو زور سے چٹکی کاٹ دی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور آنکھیں پھاڑے ادھر ادھر دیکھنے لگی اس نے جماہی لینے کے لئے جیسے ہی منہ کھولا نواز نے مٹھائی کا ایک بڑا ٹکڑا اس کے منہ میں بھر دیا اور اسے کندھے پر ڈال کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا ۔ نایاب کی نیند غائب ہو چکی تھی اس نے نواز سے پوچھا

"نواز میاں آپ مجھے یہاں کیوں لے آئے ؟

"تجھ سے شادی کرنا ہے اس لئے یہاں لایا ہوں"

"شادی ؟ کیا شادی ایسے کرتے ہیں ؟ آپ نے دیکھا نہیں شہناز بی بی کی شادی کیسے ہوئی ؟" "کیسے ہوئی ذرا بتا تو سہی"

"مگر اتنی رات گئے آپ یہ سب مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں ، اماں کہتی ہیں کہ مردوں سے اکیلے میں بات نہیں کرنا چاہیئے میں آپ سے بات نہیں کرونگی مجھے جانے دیجئے"

"شادی کیسے ہوتی ہے بتا دے پھر چلی جانا"

"ارے ! کیا آپ نے نہیں دیکھا کتنے مہمان تھے دولہا کی بارات پھولوں سے سجی موٹر میں آئی کتنی زور کا باجا بج رہا تھا" "اس کے بعد کیا ہوا ؟" "اس کے بعد دولہا کے پاس بچوں نے مصری بادام لوٹے پھر دولہا اندر آیا اسے دلہن کے بازو بٹھا کر پھول

پہنائے گئے پھر دولہا نے دلہن کو گود میں اٹھالیا اور موٹر میں بٹھا کر اپنے گھر لے گیا! کیا آپ نے یہ سب نہیں دیکھا؟" کیا تجھے معلوم ہے گھر لے جانے کے بعد کیا ہوا؟" نہیں مجھے نہیں معلوم" "ہاں تجھے وہی تو بتانا ہے کہ ...." واہ ایسے کیسے بتائیں گے پہلے آپ بھی دولہا کی طرح بارات لائیں مصری بادام لٹائیں سب کو آئسکریم کھلانے کے بعد مجھے اپنے ساتھ پھولوں بھری موٹر میں لے جائیے پھر بتائیں کہ کیا ہوتا ہے" نواز نایاب کو اپنی گود میں بٹھائے باتیں کر رہا تھا اس کے ہاتھ بھی مصروف بیکار تھے۔ رات کے پچھلے پہر ایک ڈاکو نے کچی فصیل میں نقب لگادی اور بیش بہا موتی چرالیا۔ زندگی کے پہلے تجربہ نے اس طرح مدہوش کیا کہ صبح کی سپیدی کب پھیلی پتہ نہ چل سکا۔ نواز نے اسے قسم دی کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ کسی کو یہ بات نہیں بتائے گی ورنہ وہ اس سے شادی نہیں کرے گا۔

خوابوں نے نایاب کو اپنے آپ بھلادیا وہ اب پیروں پر نہیں چلتی تھی بلکہ بن پیروں ہوا میں اڑتی تھی رنگ جوانی خوب نکھر آیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ لمبی تڑنگی فربہ سی عورت لگنے لگی گھر کے لوگوں نے اسے گھور گھور کر دیکھنا شروع کر دیا ماں نے بھی غور سے دیکھا اور اسے کریدا تو وہ شرم سے سرخ ہو گئی ماں کا ماتھا ٹھنکا زور دے کر پوچھا تو بتایا کہ کسی نے اسے اپنی دلہن بنانے کا وعدہ کیا ہے۔ زیتون کے ہزار خوشامد سے پوچھنے پر کہ وہ کون ہے کہاں رہتا ہے کیا کرتا ہے اس کا نام کیا ہے نایاب نے صرف اتنا بتایا کہ وہ ایک امیر زادہ ہے اور اس کی پڑھائی ختم ہونے کے بعد اس سے شادی کرے گا۔ زیتون نے دو دن کی چھٹی لی اپنے گھر گئی اور اپنی ایک دایہ سہیلی کو بلا کر نایاب کو دکھایا اس نے بتایا کہ اسے تیسرا مہینہ چل رہا ہے۔ زیتون روتی پیٹتی اپنی بیگم صاحبہ کے ہاں گئی سارا ماجرا کہہ سنایا اور کچھ روپئے مانگے اس کی توقع کے خلاف بیگم صاحبہ نے لعن طعن کی کہا کہ شریفوں کے گھر میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسے نوکری سے نکال دیا۔ جس وقت ماں بیٹی روتی دھوتی رخصت ہو رہی تھیں نواز سامنے کھڑا انھیں دیکھتا رہا۔ نایاب جاتے ہوئے پلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی کہ شاید نواز کسی فلمی ہیرو کی طرح اسے روک لے ماں سے بغاوت کر دے! شاید اسے اپنا کوئی وعدہ یاد آجائے لیکن وہ انجان بنا اپنے کام میں مصروف رہا۔ نایاب کے دل

میں ایک ٹیس سی اٹھی اور آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں نکلنے لگیں۔ دونوں چلی گئیں زیتون بیمار ہو گئی وہ اکثر گھر پر پڑی رہتی اور نایاب ایک دو گھروں میں کام کر لیتی۔ نواز ایک دن آیا اور زیتون کے ہاتھ میں ہزار روپئے رکھ کر چلا گیا زیتون کو جیسے ہمت آ گئی وہ فوراً اٹھی اور اپنی دایہ سہیلی کے ہاں گئی اور اس کی مدد سے نایاب کا حمل گرا دیا وہ اپنے جگر کے ٹکرے کے ضائع کئے جانے پر گھنٹوں آنسو بہاتی رہی کئی دن تک کام پر بھی نہیں گئی۔ دو دو دن بغیر کچھ کھائے پیئے ہی گزر جاتے۔ اسی دوران زیتون کو دایہ نے بتایا کہ اس کے محلے میں صبیحہ نامی ایک عورت ہے جو باہر سے آئے ہوئے شیخوں کی شادی کرواتی ہے نایاب خوبصورت ہے کسی شیخ سے اس کی شادی کر دی جائے تو ان کی دلدر گی دور ہو جائے گی۔ زیتون نے کہا کہ نایاب کی طبیعت سنبھلنے کے بعد جواب دے گی۔ نایاب نے ان دونوں کی گفتگو سن لی تھی۔ دوسرے دن وہ ٹھیک چار بجے نواز کے گھر کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اسے معلوم تھا کہ وہ چار بجے کرکٹ کھیلنے کے لئے جاتا ہے۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ نواز سفید کپڑے پہنے ہاتھ میں بیاٹ جھلاتا قیمتی سینٹ کی خوشبو اڑاتا اسی طرف آ رہا تھا وہ کچھ فاصلے پر ہی ٹھٹک گیا اور پلٹنا چاہتا تھا کہ نایاب نے اسے جالیا "کیوں نواز میاں کیسے ہو؟ اس دن بیگم صاحبہ کے سامنے ایسی ایکٹنگ کر رہے تھے جیسے تم ہمیں پہچانتے ہی نہیں آج آپ کے انداز بتا رہے ہیں کہ واقعی آپ مجھے نہیں پہچانتے۔ کہاں گئیں آپ کی وہ قسمیں اور وعدے ہمیں گھر سے نکال دیا گیا اور آپ دیکھتے رہے ہم بھوکے مرتے رہے آپ نے کبھی خبر نہ لی کیا یہی ہے آپ کی محبت کیا یہی ہے شرافت؟ نواز حیرت سے تک رہا تھا کہ نایاب کو اتنی باتیں کرنا کیسے آ گیا اس نے سنبھل کر کہا "دیکھو نایاب جو کچھ بھی ہوا اسے بھول جاؤ میں نے ابھی تعلیم مکمل نہیں کی ہے مجھے بھی گھر سے نکال دیا گیا تو میں تمہیں کہاں رکھوں گا۔ بہتر ہو گا کہ تم کسی شریف آدمی کا ہاتھ تھام لو اور سکون کی زندگی گزارو"

نواز صاحب میں نے آپ کو بھی تو شریف آدمی سمجھا تھا اور آپ کے کہنے پر آپ کا ہاتھ تھاما تھا اب اور کونسے شریف آدمی کی تلاش کروں؟ میں نے تو آپ ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا تھا آپ ہی کے قدموں میں زندگی گزارنے کا عہد کیا تھا کیا شریفوں کا

شیوہ بھی ہوتا ہے پل میں بنا دیا پل میں مٹا دیا؟

"تم سمجھنے کی کوشش کروں نایاب! میں ان حالات میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا مجھے معاف کر دو یہ لو کچھ روپے میرے پاس ہیں اپنے گھر میں راشن منگوا لینا

"یہ روپے آپ اپنے ہی پاس رکھیں نواز صاحب ہم غریب ضرور ہیں لیکن بکاؤ نہیں ہیں تم نے میرے جذبات کے ساتھ کھیلا ہے میری عزت و جوانی کو پامال کیا ہے ان سفید کپڑوں کے نیچے تم نے ایک سیاہ دل چھپا رکھا ہے تم ایک گرے ہوئے انسان ہو تمہیں ایک دن پچھتانا پڑے گا" نایاب تیزی کے ساتھ پلٹ گئی۔ ماں سے کہہ کر اس نے ایک تعلیمی ادارہ میں داخلہ لے لیا اور میٹرک کی تیاری کرنے لگی گھر کا کام کر کے ادارہ جاتی اور رات میں محلے کے بچوں کو گھر پر پڑھاتی اس کی غیر موجودگی میں زیتون دو ایک گھر کا کام کر آتی نایاب نہیں چاہتی تھی کہ ماں کوئی کام کرے لیکن ماں کو بیٹی کی شادی کے لئے پیسے جوڑنے تھے۔ اسی دوران زیتون کی سہیلی نے پھر ایک بار شیخ کے ساتھ اس کی شادی کی بات یاد دلائی زیتون کچھ سوچ کر دایہ کے سات صبیحہ سے ملنے چلی گئی اس نے بتایا کہ دوبئی کا ایک کروڑ پتی شیخ آیا ہوا ہے لڑکی خوبصورت اور کچھ پڑھی لکھی ہو سر آنکھوں پر بٹھا کر لے جائے گا۔ زیتون تنگ دستی اور بدحالی سے عاجز آچکی تھی ناامیدی کے گھپ اندھیرے میں کوئی کرن نظر نہ آتی تھی صبیحہ کی بات اس کے دل کو چھو گئی۔ اس نے نایاب سے بات کی تو وہ کچھ دیر کے لئے گہری سوچ میں ڈوب گئی ماں کی آواز پر چونک پڑی اور کسی اندرونی جذبہ کو دباتے ہوئے حامی بھر لی۔ وہ ٹھوکر کھا کر گری تھی لیکن کپڑوں کی دھول جھٹک کر کھڑی ہو گئی تھی اور اب اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کے منہ پر بھرپور طمانچہ مارنا چاہتی تھی اس نے کہا "ٹھیک ہے ماں! میں شادی کروں گی میں احساس کمتری کے دائرہ سے نکلنا چاہتی ہوں میں اس ظالم کو بتانا چاہتی ہوں کہ عورت کیا ہوتی ہے کسی معصوم اور انجان کے ساتھ دھوکہ کرنا کتنا مہنگا پڑتا ہے"

"نہیں بیٹا عورت چیلنج کرتی ہوئی اچھی نہیں معلوم ہوتی مرد طاقتور اور مکار ہوتا ہے اس سے ٹکر لینے والی عورت خود پاش پاش ہو جاتی ہے" "ماں یہ مرد مکار ہی نہیں خونخوار بھی ہوتا ہے اسے موقع ملتے ہی شہ رگ پہ منہ رکھ دیتا ہے اسے عورت

پیار کا انداز سمجھ بیٹھی اور اپنا تن من دھن سبھی کچھ اس پر نچھاور کر دیتی ہے" جو کچھ بھی ہوا اسے بھول جاؤ اور نئی زندگی کا استقبال کرو.... ٹھیک ہے ماں اب میں زندگی کا ایک ایک پل خوشی سے جی کر گزاروں گی" دوبئی سے آئے ہوئے شیخ کے ساتھ نایاب کی شادی کر دی گئی وہ نیک دل اور سیدھا آدمی تھا اس نے نایاب کی ماں کو بھی اپنے ساتھ چلنے کہا ماں بیٹی کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا نایاب کی روح کے اندر ایک کیف آگیں سا اطمینان اتر رہا تھا۔ وہ پہلی بار ایرپورٹ گئی اور پہلی بار جہاز کی لرزتی سیڑھی پر قدم رکھی تھی اور جب جہاز کے اندر داخل ہوئی تو محسوس کیا جیسے پرستان میں آگئی ہو اور پھر دوبئی کی خوشبو میں لپٹی ہوئی سرزمین پر پاؤں رکھا تو محسوس ہوا کہ جنت میں آگئی پلک جھپکتے اس جنت میں دس سال گزر گئے۔ نایاب دو بچوں کی ماں بن گئی اب وہ ایک مکمل عورت اور شیخ کی سلطنت دل کی ملکہ تھی۔ ذہنی اور جسمانی آسودگی نے حسن میں چار چاند لگا دئیے تھے وہ اپنے شوہر کا کاروبار سبنھالنے لگی تھی۔ انڈیا سے تیار شدہ ملبوسات منگوائے جاتے تھے۔ جن کا من مانے دام پر خوب سیل تھا۔ دولت نایاب کے گھر کی باندی تھی لیکن آرام و آسائش کے جھولے میں بھی اس کی روح بے قرار تھی۔ ایک تشنگی تھی کہ تن من جلاتی تھی۔ ایک کانٹا تھا کہ ہر وقت پہلو میں کھٹکتا رہتا تھا۔ ایک دن نایاب کو معلوم ہوا کہ انڈیا سے ایک ڈرائیور کو بلوایا گیا ہے جو سیلز مین کے طور پر بھی کام کرے گا کیونکہ چار سیلز مین دکان کے لئے ناکافی ہو رہے تھے اور جب وہ ڈرائیور آیا اور نایاب نے اسے دیکھا تو حیران رہ گئی وہ نواز تھا دس سالوں میں کافی بدل گیا تھا عمر سے زیادہ لگ رہا تھا اور چہرہ غربت کی کہانی سنا رہا تھا۔ نایاب کو اس کی حالت پر رحم نہیں آیا بلکہ چہرہ پر ایک فاتح جرنیل کی زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی جیسے اس نے اپنے شکار کو چت کر لیا ہو۔

مجرم کون ؟

جب لگیں زخم تو قاتل کو دعا دی جائے
ہے یہی رسم تو یہ رسم اٹھا دی جائے
دل کا وہ حال ہوا ہے غم دوراں کے تلے
جیسے اک لاش چٹانوں میں دبا دی جائے
تم بھی مجرم ہو فقط میں ہی گنہ گار نہیں
میں یہ کہتا ہوں کہ دونوں کو سزا دی جائے

جانثار اختر

ظالم مرد نے ہر دور ہر زمانے میں عورت کو ایک کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں دی اسے ہمیشہ بیچا اور خریدا اور جب دل چاہا توڑ بھی دیا، کیا دنیا میں کوئی مرد ایسا نہیں جس کی چوکھٹ پر قدم رکھنے کے بعد دل کہہ اٹھے کہ ہاں اسے روح کی گہرائیوں سے چاہو، اسی کی پناہوں میں زندگی کے حسین لمحے گزار دو اور اسی کی باہوں میں موت کو گلے لگالو۔۔۔۔۔

زیبا بیوٹی کلنک کا شہر میں بڑا چرچا ہو رہا تھا۔ اونچے گھر کی بیگمات ہمہ وقت وہاں لائین لگائے نظر آتیں۔ رش کے باعث بیوٹی کلنک کی مالک زیبا بھی شام میں اپنی اسٹنٹس کے ساتھ مصروف ہو جاتی۔ آج وہ اپنے کیبن میں بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی کہ بہت ہی کم وقت میں اس کے بیوٹی کلنک نے ترقی اور شہرت کی حدوں کو چھولیا اور خاصی آمدنی ہونے لگی جانے کیا بات ہے کہ یہ عورتیں تیس پینتیس کے اوپر ہوئیں اور کسی بیوٹی کلنک کا رخ کرنے لگتی ہیں! عورت بیچاری کرے بھی کیا شوہر صاحب کے بار بار نکتہ چینی کرنے سے تنگ آکر ہمارا سہارا لیتی ہے، کوئی کہتا ہے کہ اب اس میں پہلی سی کشش نہیں رہی رنگ بھی پھیکا پڑ گیا ہے۔ کوئی کہتا کہ وہ موٹی ہو گئی ہے توند بھی نکل آئی ہے کسی کو شکایت ہے کہ چہرے پر جھریاں نظر آرہی ہیں اور آنکھوں کے اطراف سیاہ حلقے اور سر میں سفید بال نمودار ہو رہے ہیں آخر یہ مرد کیا چاہتے ہیں بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ انہیں بھی سمجھوتہ کرنا ہی چاہیے بیچاری بیوی کبھی ان سے یہ نہیں کہتی کہ ان کے سر پر بال کم ہو گئے ہیں، آنکھوں پر موٹے چشمے کی عینک لگ گئی ہے یا ان کی توند بڑھ گئی ہے اور وہ اب تند مزاج ہو گئے ہیں وغیرہ انہی سوچوں میں گم زیبا اس وقت چونکی جب ایک ۲۶۔۲۷ سالہ حسین خاتون خوش رنگ لباس زیب تن کئے کلنک میں داخل ہوئی جس کے جگمگاتے ہیروں کے سٹ پر زیبا کی نظر جم سی گئی۔ ہاں یہ وہی سٹ ہے جو کبھی اس کے گلے کی زینت ہوا کرتا تھا اور ایک دن اچانک اس کی الماری کے سیف سے غائب ہو گیا تھا زیبا سوچ رہی تھی یہ وہی ہے وہ دن اسے یاد تھا جب وہ اپنے محل نما مکان میں دہشت زدہ سی گھوم رہی تھی وہ محل جہاں اسکی خدمت پر کئی ملازم مامور تھے اس دن کسی غریب کی کٹیا جیسا لگ رہا تھا۔ وہ پھر ایک بار مرد کی فطرت پر غور کر رہی تھی جو عورت کو ہزار جکڑ بندیوں میں رکھ کر ہر طرح کی خدمت لینے کے بعد دو روٹی احسان جتانے کے انداز میں دیتا ہے مرد کی طبیعت کا کوئی بھروسہ نہیں موسموں کی طرح بدلتی رہتی ہے اور اسی مرد کے لئے عورت تن من کی بازی لگا دیتی ہے۔ آج کی عورت نے اپنی برتری تو منوالی، مرد کے شانہ بشانہ چلنا سیکھ لیا اور زندگی کے ہر میدان میں اڑان بھرنے لگی ہے پھر بھی وہ مرد کے سہارے کی محتاج ہے لیکن عورت کی رفاقت کے بغیر وہ بھی تو ادھورا ہے اس

حقیقت کو دنیا کے ہر آدم و حوا نے تسلیم کیا ہے زیبا نے بچپن سے جوانی تک اپنی ماں پر شرابی باپ کے مظالم دیکھے تھے مرد ذات سے اسے نفرت سی ہو گئی تھی خاندان کی عزت خاک میں مل گئی تھی نہ کبھی کسی نے پیٹ بھر کھایا نہ ہی کوئی تن کو سلیقے سے ڈھک سکا۔ پانچ بہنیں اور ایک بھائی جو چوتھے نمبر پر تھا۔ سب کو ماں نے ایک سرکاری اسکول میں شریک کرادیا تھا۔ باپ جو ایک دفتر میں کلرک تھا اسے گھر یا گھر کے افراد سے، جیسے کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ اگر میاں کو کبھی کچھ کہتی تو طلاق کی دھمکی دیتا اور ماں جانے کیا سوچ کر چپ ہو جاتی۔ اخراجات پورا کرنے کے لئے اس نے اپنے موروثی مکان کا آدھا حصہ کرائے پر اٹھا دیا تھا۔ زندگی جوں توں گزر رہی تھی۔

زیبا سب سے بڑی تھی وہ ماں کے دکھوں کو سمجھنے لگی تھی۔ اوپر والے نے اسے حسن کی دولت سے مالا مال کیا تھا اور اس حسن جہاں سوز کے چرچے دور دور تک تھے ایک انجانی قوت ارادی کے تحت اس نے بی۔اے پاس کر لیا اور اس کی شادی کی فکر نے ماں کی راتوں کی نیند اور دن کا چین چھین لئے جبکہ زیبا کو شادی سے نفرت تھی وہ ملازمت کر کے بہنوں کی شادی اور بھائی کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہتی تھی ماں کے غم کو بانٹنا چاہتی تھی مرد کے سہارے کے بغیر وہ آسمان کو چھونا چاہتی تھی۔ ایک دن پڑوسن خالہ اس کے لئے جلیل نواب کا رشتہ لے آئیں گھنٹہ بھر تک جانے ماں کو کیا سمجھاتی رہیں کہ ماں نے رو رو کر برا حال کر لیا اپنے دودھ کی قسم دی اور زیبا کو ہاں کرتے ہی بنی۔ بیٹی کے روشن مستقبل کے تصور میں ماں نے یہ نہیں دیکھا کہ جلیل نواب کی عمر زیبا کی عمر سے دو گنی ہے۔ زیبا کو انہوں نے وہ سب کچھ دیا جو اس کے تصورات سے بالاتر تھا۔ اس کا رنگ روپ نکھر آیا تھا۔ اس کے حسن و جوانی کے نشہ میں سرشار چھ مہینے کب کھسک گئے پتہ ہی نہ چلا۔ ایک دن اچانک جلیل نواب کو اپنا آنگن سونا سونا لگنے لگا۔ نامی گرامی حکیم اور ڈاکٹرس نے زیبا کا علاج کیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا اور اس دن انہیں فون پر کسی سے بات کرتے سن لیا شاید وہ کسی دوست سے مخاطب تھے " بھئی اس کا آدھا چہرہ تو جھلس گیا ہے اب وہ ہمارے کس کام کی ؟ بڑا نقصان ہوا! خیر تم شام تک طلاق کے کاغذات لالو او ، ہاں دو دن بعد نکاح کی تاریخ مقرر کرا دینا " زیبا کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی کیا وہ مجھے طلاق دے رہا ہے ؟

وہ مجھے گھر سے بے گھر کر دے گا کیا وہ اپنے پیار کی قسموں کو توڑ دے گا اور میری سوت لائے گا؟ مرد نے ہر دور ہر زمانے میں عورت کو ایک کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں دی اسے ہمیشہ بیچا اور خریدا اور جب دل چاہا توڑ بھی دیا! کیا دنیا میں کوئی مرد ایسا نہیں جس کی چوکھٹ پر قدم رکھنے کے بعد دل کہہ اٹھے کہ ہاں اسے روح کی گہرائیوں سے چاہو، اسی کی پناہوں میں زندگی کے حسین لمحے گزار دو اور اسی کی باہوں میں موت کو گلے لگالو کہ یہی ہے سچا مونس و غم خوار! زیبا خوش تھی کہ اس کی مدد سے ایک بہن کی شادی ہو گئی تھی۔ بھائی شہر کے معیاری اسکول میں تعلیم پا رہا تھا ماں بھی برسوں اپنی ہڈیاں تڑوانے کے بعد چین کا سانس لے رہی تھی۔ اب کیا ہوگا کیا مجھے پھولوں کی سیج چھوڑ کر خار دار جھاڑیوں میں راستہ بنانا پڑے گا؟ انہی سوچوں میں گم پہلے اس نے اپنا زیور سیف سے نکال کر ایک ڈبہ میں رکھا لیکن تلاش بسیار کے باوجود ہیروں کا وہ ہار نہیں ملا جو نکاح کے دن اسے منہ دکھائی کا تحفہ ملا تھا آج تک جسے وہ راہبر سمجھتی رہی تھی کیا وہ راہزن تھا؟ مختلف اندیشوں نے اسے گھیر لیا۔ شام بڑی تیزی سے آنگن میں نہیں بلکہ اسکی زندگی میں اتر رہی تھی کال بل کی آواز نے اسکی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دیا وہ اپنے آپ کو سنبھال رہی تھی اور کچھ دیر بعد وہ فیصلہ ہو گیا جس کے لئے وہ صبح سے اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی اکیس ہزار کی رقم کے ساتھ جلیل نواب نے اس کے ہاتھ میں طلاق نامہ پکڑا دیا! نہ کچھ کہا نہ سنا ڈرائیور کے ساتھ ماں کے گھر بھیج دیا۔ کتنا خود غرض ہوتا ہے یہ مجازی خدا اپنی غرض کے لئے ایک عورت کے سجدے کرتا ہے اور دل بھر جائے تو اسی عورت کو پرانے جوتے کی طرح اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔

زیبا نے اپنے آپ کو سنبھالا اس کے اندر سوئی ہوئی وہ عورت جاگ اٹھی جسے مردوں سے نفرت تھی اس نے خار دار جھاڑیوں میں اپنا راستہ بنالیا اور زندگی کے ساتھ چل پڑی آج وہ شہر کے مشہور و معروف بیوٹی کلنک کی مالک تھی اس کی ایک اسسٹنٹ نے کیبن کے دروازہ پر کھٹکا دیا اور اجازت لے کر اندر آئی "میڈم آج رش کچھ زیادہ ہے آپ کی مدد کی ضرورت ہے کئی خواتین منتظر اور بے چین ہیں"

"اچھا تم چلو میں آرہی ہوں، دیکھو ہیروں کا سٹ پہنی ہوئی جو خاتون بیٹھی ہیں

نا انہیں میں دیکھو نگی"

"بہتر ہے" ۔ چند لمحوں کے بعد وہ باہر آئی اور اس خاتون سے دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کہا

"اگر آپکو جلدی نہ ہو تو کچھ دیر انتظار کریں میں خود آپ کو اپنا وقت دونگی"

"جی کوئی خاص جلدی نہیں ہے میں انتظار کرونگی"

زیبا نے جلدی جلدی منتظر خواتین کی ضرورت اور خواہش کے مطابق میک اپ کیا اور پھر اس کی طرف واپس آئی جو بڑی دلچسپی سے اس کا کام دیکھ رہی تھی ۔ زیبا نے پوچھا "کیا میک اپ چاہتی ہیں آپ؟

"میڈم ایسا میک اپ کریں کہ دیکھنے والے کا ایمان ڈگمگا جائے اور عاشق اپنی جان ہتھیلی پر رکھدے"

خاتون نے معنی خیز انداز میں فرمائش کی تھی ۔ زیبا نے بے ساختہ کہا "کیا شراب ناب کو دو آتشہ بنا کر پیش کرنا چاہتی ہیں؟ ویسے آپ کا حسن توبہ شکن کسی بھی راہ چلتے کو منزل سے بھٹکانے کے لئے کافی ہے"

"بات یہ ہے میڈم کے مجھے ان کے دوست کے لڑکے کی شادی میں جانا ہے اور ان کی خواہش ہے کہ اس تقریب میں مجھ سے بڑھ کر کوئی حسین نہ ہو ہر نگاہ کا مرکز سوائے میرے کوئی اور نہ ہو"

معلوم ہوتا ہے آپ انہیں بہت چاہتی ہیں اسی لئے ان کی خواہش کو سر آنکھوں پر رکھا ہے ویسے فطرتاً عورت حسین سے حسین تر نظر آنے کی خواہشمند ہوتی ہے ۔

"نکہت نے مسکراتے ہوئے کہا

جی ہاں آپ کا خیال درست ہے انہوں نے مجھے غربت کی زندگی سے نکال کر مسند شاہی پر بٹھا دیا ہے وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں

"بڑی خوش نصیب ہیں ۔ کیا آپ پہلے ملازمت کرتی تھیں؟ زیبا نے پوچھا

"ہاں میں ایک نرس تھی اپنے اسٹاف اور مریضوں میں ہر دلعزیز تھی" نکہت نے جواب دیا ۔

"پھر تو آپ خاصی تجربہ کار ہیں آپ نے عورتوں اور مردوں کو قریب سے دیکھا

ہے کیا سب مرد اپنی بیویوں سے پیار کرتے ہیں ؟ زیبا نے نکہت کے چہرے پر فاؤنڈیشن پھیلاتے ہوئے سوال کیا۔

" بھئی یہ تو اپنی اپنی طبیعت ، ماحول اور سب سے زیادہ قسمت پر منحصر ہے۔ میری نڈر طبیعت اور خوش مزاجی کے لحاظ سے مجھے اکثر میل وارڈ میں رکھا گیا تھا جہاں مردوں نے مجھے اپنائیت کے ساتھ اپنی دکھ بھری زندگی کے حالات سنائے اور میں نے اکثر، عورت کو خود غرض پایا ہے۔

"آپ کو اپنے بارے میں ایک بات بتاؤں ؟نکہت نے کہا

"ہاں ہاں بتایئے آپ کی باتوں میں میری دلچسپی بڑھ رہی ہے "نکہت نے کہا"

میں نے خاندان کی مخالفت کے باوجود نرسنگ کا پیشہ اپنایا میرے والد ذرا سخت واقع ہوئے تھے وہ عورت کو ایک مخصوص دائرہ میں دیکھنا چاہتے تھے ۔ وہ ہمارے کھانے کپڑے اور تعلیم کا خاص خیال رکھتے تھے بس وہ فضول خرچی کے مخالف تھے ان کے برعکس ماں بڑی فضول خرچ تھیں ۔خاندان والوں کے آگے جھوٹی شان دکھانا ہر چھوٹی بڑی تقریب میں قیمتی تحفے دینا انہیں بہت پسند تھا ایسی ہی اور باتوں پر ان دونوں میں اکثر بحث ہوجاتی اور بات چیت بند ہوجاتی پھر دوچار دن بعد حالات معمول پر آجاتے ۔آخری عمر میں بھی والد نے ماں کی مرضی کے خلاف اپنا علاج سرکاری دواخانہ میں کروایا ان کا کہنا تھا کہ موت کو جب آنا ہو تب ہی آئے گی اور دواخانہ میں ایک نرس کی لاپرواہی نے ان کی جان لے لی شاید ان کا وقت ہی آچکا تھا بس اس کے بعد ہی میں نے فیصلہ کیا کہ میں نرس بنونگی محنت اور محبت سے تمام مریضوں کی دیکھ بھال کرونگی ۔والد کی موت کے بعد ماں نے ساری جمع پونجی جھوٹی شان و شوکت اور شوق کی نظر کردی اور ہم دونوں بہنوں کی شادی کے لئے تک کچھ نہ رکھا مرحوم شوہر سے انھوں نے شاید اس طرح بدلہ لیا تھا پھر مجھے نرس کا پیشہ ہی مناسب معلوم ہوا جہاں میں والد کی طرح ستائے ہوئے اور لوگوں کی دلجوئی اور ہمت افزائی کرتی رہی ان کے دکھ بانٹتی رہی " ۔نکہت خاموش ہوئی تو زیبا نے پوچھا" عورت بھلا کس طرح ایک مرد سے بدلہ لے سکتی ہے ؟وہ تو ایثار اور وفا کی مورت ہوتی ہے ! راہ وفا میں راکھ ہوجاتی ہے " " بھئی ان عورتوں کے انتقام لینے کے انداز نرالے ہوتے ہیں ایک

بیوی صاحبہ شوہر کی وظیفہ پر علحدگی کے بعد اس سے اتنی متنفر ہو گئیں کہ وہ اپنی عمر کا آخری حصہ اپنی بہن یا بھائی کے گھر گزارنے پر مجبور ہو گیا۔ کسی نے ایک نظر محبت کے لئے اتنا ترسایا کہ بیچارہ جنگلوں کی طرف نکل پڑا اور ایک نے تو انسانیت کی حدیں توڑ دیں دولت کے لالچ میں شوہر اور بچوں کو چھوڑ کر کسی بنگلے کے مالک موٹر نشین کو اپنا ہمنشیں بنالیا۔ ان واقعات کو سن سن کر میرے دل میں یہ ارادہ پکا ہوتا جاتا کہ میں ایک وفادار بیوی بنونگی اور ہر حالت میں شوہر کا ساتھ دونگی"

زیبا نے ٹھنڈی سانس لے کر پوچھا "ہم ابھی تک ایک دوسرے کے نام سے بھی واقف نہیں اور باتیں ایسے ہو رہی ہیں جیسے پرانی دوست ہوں" "جی مجھے نکہت کہتے ہیں" "اچھا تو نکہت صاحبہ آپ ان مردوں کے بارے میں کیا کہیں گی جو بیوی کو اپنے جسم کا ایک حصہ سمجھنے کی بجائے اپنی باندی سمجھتے ہیں کبھی تو ناواجبی مطالبات کی آگ میں جلاکر راکھ کر دیتے ہیں اور کبھی ان کے چمن زندگی میں ایک پھول نہ کھلانے کے جرم میں صحرانوردی کیلئے چھوڑ دیتے ہیں تو کبھی گھریلو الجھنوں میں الجھ کر روح کو تک زخمی کر دیتے ہیں اور کبھی اپنی انمٹ بھوک کو مٹانے کے لئے ایرے غیرے کے نوالوں پر منہ مارتے یا پھر اس کی سوت لے آتے ہیں اور زندگی میں توڑ پھوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ میں بھی ایک ظالم کے تیر سے گھائل ہوئی ہوں میرے گال پر یہ سلوٹیں دیکھ رہی ہو؟ ایک تقریب کے موقع پر پکوان کے دوران جھلس جانے کی وجہ سے اس نے مجھے طلاق دے دی" نکہت پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی زیبا کے دائیں گال کی سلوٹوں نے اس کے حسن کے چاند کو گہنا دیا تھا۔

اسے خاموش پاکر زیبا نے کہا "ایک بات پوچھوں؟" "ضرور پوچھئے" نکہت نے کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیا "تم نے یہ ہیروں کا ہار کہاں سے خریدا؟" "جی یہ میرے شوہر نے مجھے منہ دکھائی کا تحفہ دیا تھا" "کیا تم جلیل نواب کی بیگم ہو؟" زیبا نے حیرانی سے پوچھا

جی ہاں! لیکن آپ نے کیسے جانا؟" "کبھی میں بھی ان کی بیوی تھی یہ ہار مجھے بھی منہ دکھائی کا تحفہ ملا تھا" اب نکہت زیبا کو حیرانی سے تک رہی تھی۔ زیبا کہہ رہی تھی "مجھے بعد میں یہ معلوم ہوا کہ خود جلیل کے اندر بچے پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں تھی

اور وہ ہر چار چھ ماہ بعد یہ کہہ کر طلاق دیتا ہے کہ بیوی اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے پہلے چار پانچ کو طلاق دے چکا ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان میں سے کسی کے بھی بارے میں پتہ نہیں کہ کہاں اور کس حال میں ہے

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا میں نے ایک مرد کا ہمیشہ احترام کیا ہے اس کا ہر روپ مجھے اچھا معلوم ہوا چاہے وہ باپ ہو یا بھائی شوہر ہو یا بیٹا وہ اکثر حالات میں معصوم اور مظلوم بھی رہا ہے" نکہت پر گھبراہٹ طاری تھی۔

"نکہت بیگم ابھی تم نے دنیا دیکھی ہی نہیں یہاں ہمہ اقسام کے مرد ہیں اور قسم ہا قسم کی عورتیں ہیں تمہارے کہنے کے مطابق نصیبوں کی بات تو ٹھیک ہے۔ آج کے اس آزاد معاشرہ میں عورت آزاد ہے اور آزادی کے اصول اور ضابطے بھی ہیں عورت پہلے خود اپنا احترام کرنا سیکھے مرد کو اس کا مقام ضرور دے لیکن اس کے پیروں کی گرد نہ بنے۔ تم جلیل نواب سے محتاط رہو تو بہتر ہے ایسا نہ ہو کہ تم بھی تقدیر کے دھکے کھانے کے لیئے زندگی کے بازار میں چھوڑ دی جاؤ بظاہر ماڈرن بن کر بھی لکیر کی فقیر نہ بنی رہنا کیونکہ زمانہ بہت خراب ہے"۔

باتوں ہی باتوں میں زیبا نے اپنے مشاق ہاتھوں سے نکہت کے حسن میں چار چاند لگا دیئے لیکن نکہت کی آنکھوں میں فکر و خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔ تقریب میں جانے کا موڈ ہی ختم ہو گیا تھا لیکن جانا تو تھا۔ وہ بہت جلد دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

دوسری صبح شہر کے مشہور اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی کہ شہر کا نامی گرامی رئیس جلیل نواب اپنی بیوی کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا کیونکہ اس کی گھناؤنی سازش کا پتہ چل گیا تھا کہ اس نے اپنی حسین بیوی کا سودا کسی غیر ملکی سے خطیر رقم کے عوض کر دیا تھا۔ جب بیوی کے علم میں یہ بات آئی تو دونوں میں بحث و تکرار چلی اور پھر ہاتھا پائی ہوئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا تعلق عورتوں اور بچوں کا سودا کرنے والے کسی گروہ سے تھا۔ اس خبر کو پڑھنے کے بعد زیبا کو سکون سا محسوس ہوا۔ لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ اصلی مجرم کون ہے کیا وہ مرد جس کے ہاتھوں میں ایک گھر ایک خاندان اور ایک قوم کی باگ ڈور ہوتی ہے جو کبھی کبھی اتنا خود غرض ہو جاتا ہے کہ عورت کا

مول تول کر بیٹھتا ہے یا وہ عورت جو ماں بن کر بچپن میں اسے پاؤں پر کھڑا ہونا، چلنا اور دوڑنا سکھاتی ہے بہن بن کر محبت کا آنچل اس کے سر پر پھیلاتی ہے اور بیوی بن کر زندگی کو گلزار بنا دیتی ہے۔

پشیماں

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا میرا وضو ہو نالہ میری دعا ہو
ہر دردمند دل کو رونا میرا رلادے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگادے

ایک شوہر نے اپنی بیوی پر ناکردہ گناہ کاالزام لگایا تھا شوہر جو ایک عورت کی سب سے بڑی طاقت ہوتا ہے شوہر جس کی چوکھٹ پر سر رکھ کر جان دے دینا ہر عورت اپنا مقصد حیات سمجھتی ہے۔ آج اس کے شوہر نے خود اسے دنیا کے سامنے ننگا کر دیا تھا ایک عورت کے بھرم کو پامال کیا تھا۔

آج اس کا دل اداسی کے سیاہ سمندر میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ رات بھی سیاہ اور سیاہ ہو چلی تھی۔ وہ اپنے آپ کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی اپنے ڈرائینگ روم میں بیٹھی ہوئی ان مچھلیوں کو دیکھ رہی تھی جو اکویریم کے شفاف ٹھنڈے پانی میں پر سکون نظر آرہی تھیں جاڑے کی سرد رات میں چاند بھی ٹھنڈا اور پر سکون تھا جس کی چاندنی سارے ماحول کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی ثمینہ بھی برف کا تودہ بن چکی تھی لیکن آج اس کے اندر کہیں ایک شعلہ سا بھڑک رہا تھا اچانک اسے محسوس ہوا کہ ڈرائینگ روم کسی بھٹی میں تبدیل ہو گیا ہے وہ اپنے سامنے اپنے قاتل کو کٹہرے میں کھڑا دیکھ رہی تھی جس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ ثمینہ جیسے پھٹ پڑی "عدالت تمہیں پھانسی کی سزا سنائے گی اور یہ فیصلہ تمہیں قبول کرنا پڑے گا کیونکہ تم نے میرا خون کیا ہے میرے قاتل ہو میری لاش کو دیکھ کر کوئی ہنستا اور کوئی روتا ہے لیکن عدالتوں کے فیصلے ہمیشہ مظلوم و مقتول کے حق میں نہیں ہوتے مجرم و قاتل اکثر صاف بچ نکلتے ہیں اور اگر ایسا ہوا تو قدرت تم سے وہ انتقام لے گی کہ تم زندگی سے بیزار ہو جاؤ گے موت کی دعائیں مانگتے رہو گے ایک خارش زدہ کتے کی طرح تل تل کر مرتے رہو گے اور تمہارا یوں مرنا مجھے اچھا معلوم ہو گا کیونکہ تم نے میرا خون کیا ہے۔ تمہارے ہم جنسوں نے رفیعہ کو پاگل کر دیا ہے وہ میری اچھی دوست تھی ہم دونوں ایک دوسرے کا غم غلط کیا کرتے گھنٹوں ایک دوسرے کو بہلاتے اور تسلی دیا کرتے تھے اس کا قصور بس یہ تھا کہ وہ دنیا میں آئی تو سانولا رنگ لے کر آئی تھی سرو جیسا قد لمبے بال ستواں ناک اور بڑی بڑی بادامی آنکھیں تم لوگوں کے معیار حسن پر پوری نہ اتر سکیں اور اسے سہاگ کا جوڑا نصیب نہ ہو سکا تم لوگوں نے ہر بار اسے دھتکارا۔ اس کے دل کو چور چور کیا ستائیس سال تک بنا ملاح بنا پتوار وہ اپنی زندگی کی ناؤ کھیتی رہی اپنے دولہا کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ گم سم ہو گئی گونگی بہری ہو گئی جانے کتنی سانولی سلونی جوانیاں معیار حسن کی قربان گاہ پر سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہیں تم لوگوں نے بیوہ کی شادی کو معیوب قرار دیا اور تم جیسے ظالموں کے چنگل سے چھوٹی ہوئی مطلقہ لڑکیوں سے شادی کرنا تم لوگ پاپ سمجھتے ہو یہ لڑکیاں کہاں جائیں اپنی جوانی کیسے کاٹیں اور جب ان سے کوئی بھول ہو جاتی ہے تو تم

ہی لوگ اسے سنگسار کر دیتے ہو۔ تم اپنی حرکتوں پر شرمندہ ہونے کے بجائے مسکرا رہے ہو تم بے شرم ہو بے غیرت ہو۔ مجھے دنیا کی ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ کر تماشہ دیکھ رہے ہو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کرونگی تم نے مجھے اس مقام پر لا پٹکا ہے جہاں میں جی تو رہی ہوں لیکن زندگی سے کترا رہی ہوں اور زندگی سے کترا کر جینے کو میں نے ایک آرٹ بنالیا ہے اس آرٹ کا میں نے سہارا نہ لیا ہوتا تو خودکشی کر لیتی کیونکہ جینے کے لئے ہر انسان کو ایک سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میری باتیں سن کر تم ہنس رہے ہو؟ تم دیکھنے میں ایک بھرپور مرد نظر آتے ہو لیکن تمہاری یہ ہنسی کس قدر کھوکھلی اور بے جان ہے جیسے کسی پرانے ٹوٹے ہارمونیم سے نکالا ہوا بے معنی سرا!" اس نے میز پر رکھا ہوا پیپر ویٹ اٹھا کر کٹہرے کی طرف دے مارا جو دیوار سے جا لگا۔ سناٹا چیخ پڑا وہ چونک گئی۔ رات کی سیاہی کچھ اور دبیز ہو گئی تھی اس کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا چاند بادلوں کی اوٹ لئے تیز تیز چلا جا رہا تھا اکویریم کی مچھلیاں ٹھنڈے پانی میں بے چین نظر آ رہی تھیں وہ کمرے سے باہر نکلی اور ستاروں بھرے آسمان کے نیچے کھڑی انھیں گھور رہی تھی جو ہر رات آسمان سے ٹوٹ کر زمین پر گرتے اور مٹی میں مل جاتے ہیں اس کی آنکھیں جل رہی تھیں نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا کسی سگریٹ کی خوشبو اسے اپنے آس پاس محسوس ہو رہی تھی۔ آج وہ اس وقت چونک پڑی تھی جب اسکول کے آفس روم میں ایک شخص دو بچوں کے داخلے کے لئے آیا اور اسی خوشبودار سگریٹ کی بو اس کی ناک میں گھستی چلی گئی جس نے پندرہ سال پہلے اسے چونکا دیا تھا پھر ایک سیاہ دھواں اس کی زندگی کے افق پر چھاتا چلا گیا تھا۔ اس نے آنے والے کو غیر ارادی طور پر دیکھا تو خود اسے عالم محویت میں اپنی طرف دیکھتا ہوا پایا۔ "تشریف رکھئے" ثمینہ کی آواز میں ارتعاش تھا ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں آنے والا یوں بیٹھ گیا جیسے اس پر مسمریزم کر دیا گیا ہو اس کی نظریں ثمینہ پر مرکوز تھیں۔ "فرمائیے" ثمینہ نے سنبھل کر کہا۔

"میں اپنے بھانجوں کے داخلے کے لئے آیا ہوں" اجنبی کا لہجہ ایسا تھا جیسے نیند میں بڑبڑا رہا ہو۔ ثمینہ نے بل بجا کر چپراسی کو بلایا اور آنے والے کو ایڈمیشن روم تک پہنچانے کہہ دیا۔ اس پر عجیب سی وحشت طاری تھی کچھ دیر بعد اس نے اپنی گاڑی نکالی

اور گھر چلی گئی۔ ڈرائینگ روم میں بیٹھی وہ سوچ رہی تھی زندگی کے چلن بھی کیسے نرالے ہوتے ہیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ پندرہ سال پہلے جب اس نے انٹر پاس کیا تھا والدین نے بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی کی ایک مکان دیا اور بے حد و حساب سامان کے ساتھ اسے رخصت کیا۔ ہر نوجوان لڑکی کی طرح اس نے بھی سوچا تھا اس کے خوابوں کا شہزادہ دنیا بھر سے انوکھا ہوگا اور اسے انوکھی خوشیاں دے گا۔ جب شادی ہوئے چھ ماہ کا عرصہ ہوا تب اس نے ایک دن ساس نندوں کی دبی دبی سرگوشیاں سنیں جو اس کی طرف سے نئے مہمان کی خوشخبری نہ ملنے پر برہم ہو رہی تھیں اور پھر ایک دن ساس نے کھلے الفاظ میں تنبیہ کی کہ وہ اپنے ماں باپ کے پاس جائے اور بچہ ہونے کے لئے علاج کروائے ورنہ وہ لوگ وسیم کی دوسری شادی کر دیں گے وسیم نے ثمینہ کو تسلی دی اور ماں سے کہا کہ وہ خود اس کا علاج کروائے گا۔ کمسن ثمینہ حیران تھی کہ آخر وہ کیونکر بچہ پیدا کر سکتی ہے نرم نرم روئی کے گالوں جیسے بچے اسے بھی پسند تھے لیکن وہ ماں بنتی بھی تو کیسے؟ اس کے کنوارے خواب تو آج تک کنوارے ہی تھے۔ بے بس ثمینہ کے پاس رونے اور صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا دو دن بعد وسیم نے ماں کو بتایا کہ وہ ثمینہ کو علاج کے لئے چند دن تک دواخانہ لے جائے گا اور وہ اسے اپنے ایک دوست مجیب کے ہیلتھ کیئر سنٹر لے گیا۔ مجیب شاید ان ہی کا منتظر تھا اس نے ثمینہ کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وسیم اسے وہاں چھوڑ کر جا چکا تھا۔ وسیم نے لیڈی انچارج کو بلوا کر ثمینہ کو اندر بھیج دیا۔ اب وہ ہر روز آتی اور مختلف ورزشیں یوگ آسن کرتی۔ دوا کے طور پر اسے کچھ نہ کچھ کڑوی کسیلی چیزیں پلائی جاتی رہیں۔ ثمینہ خوش تھی کہ بچہ ہونے کے لئے اس کا علاج کیا جا رہا ہے۔ (عورت بھی کتنی عجیب مخلوق ہے آنکھ بند کر کے مرد پر بھروسہ کر لیتی ہے) اپنے شوق کے پروں پر سوار وہ ایک عجیب دنیا کی سیر میں محو تھی۔ ماں بننے کا شوق شاید ہر عورت کی فطرت میں داخل ہے۔ ایک دن جب سنٹر کا وقت ختم ہو چکا اور سب لوگ جا چکے تھے۔ مجیب اپنے آفس روم میں ثمینہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اس نے کہا تھا کہ آج اس کا معائنہ کیا جائے گا۔ وسیم بھی اسے لینے اپنے ٹائم پر نہیں آیا تھا۔ اس نے گلاس میں ثمینہ کو کچھ پینے کے لئے دیا اور ایک ہی سانس میں پی لینے کہا ثمینہ نے گلاس اٹھایا اور

خوشی خوشی پی گئی اسے یوں محسوس ہوا جیسے حلق سے پیٹ تک آگ سی لگ گئی ہو وہ کچھ پریشان سی ہو گئی مجیب نے اسے تسلی دی اس کی پیٹھ کو سہلایا گلے اور سینے کو بھی سہلایا چند ہی منٹوں بعد ثمینہ لڑکھڑانے لگی اس کی نشہ بار آنکھیں سرخ ہو گئیں مجیب نے آگے بڑھ کر اسے اپنی باہوں کے حصار میں کس لیا اور اس کے تھرتھراتے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اسی وقت وسیم ایک کیمرہ کے ساتھ وہاں آگیا اور مختلف زاویوں سے ان دونوں کی تصاویر لیا۔ کچھ دیر بعد مجیب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ثمینہ کو لے کر چلا گیا۔ گھر جا کر ثمینہ سے باز پرس کی کہ وہ اکیلی مجیب کے کمرے میں کیوں گئی اور کیا کر رہی تھی ثمینہ نے جواب دیا "آپ کے دوست نے مجھے معائنہ کے لئے رکنے کہا اور آپ بھی تو وقت پر نہیں آئے تھے نا!!" تم نے شراب کیوں پی تھی ؟ وسیم نے پوچھا۔

"شراب ؟ میں کیا جانوں شراب کیا ہوتی ہے ؟

"مکار عورت میرے ساتھ چالبازی کرتی ہے زبان چلاتی ہے ؟"

بتا کیا کر رہی تھی اس کے کمرے میں ؟

"میں کچھ نہیں کر رہی تھی میں نے کچھ نہیں کیا" اسی وقت وسیم نے اس زور کا تھپڑ رسید کیا کہ ثمینہ چیخ پڑی ماں بہنیں دوڑی ہوئی آئیں وہ پہلے سے انکی گفتگو سن رہی تھیں ماں نے کہا "کمینی کو علاج کے لئے بھیجا تو میاں کے یار کے ساتھ گلچھرے اڑانے لگی دفع کرو اسے یہاں سے" ۔۔۔۔ دوسرے دن اس پر بدکرداری کا الزام لگاتے ہوئے وکیل کے ذریعہ طلاق نامہ بھیج دیا گیا۔

ایک شوہر نے اپنی بیوی پر ناکردہ گناہ کا الزام لگایا تھا۔ شوہر، جو ایک عورت کی سب سے بڑی طاقت ہوتا ہے شوہر، جس کی چوکھٹ پر سر رکھکر جان دے دینا ہر عورت اپنا مقصد حیات سمجھتی ہے۔ آج اس کے شوہر نے خود اسے دنیا کے سامنے ننگا کر دیا تھا ایک عورت کے بھرم کو پامال کر دیا تھا۔ اس نے بھی کبھی محبتوں کے وہ حسین خواب دیکھے تھے جس کی تعبیر اس کے نصیب میں نہ تھی۔ اس کی گرتی ہوئی صحت کو دیکھتے ہوئے والدین نے اس اس گھر اور شہر کو چھوڑ دیا۔

ثمینہ نے اسکول کھول لیا تھا۔ ساتھ ساتھ بے بی کیئر سنٹر بھی تھا جہاں

ملازمت کرنے والی ماؤں کے بچوں کی دیکھ بھال خود ثمینہ کرتی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو بہلا لیا اور زندگی کے ساتھ چل پڑی تھی۔ وہ دو تین دن تک اسکول نہیں گئی اور جب گئی تو اس کی اسسٹنٹ نے بتایا کہ وہ صاحب جو دو بچوں کے داخلے کے لئے آئے تھے تین دن سے ہر روز آرہے ہیں اور آج اس کے نام ایک رقعہ چھوڑ گئے ہیں۔ ثمینہ کا دل بری طرح دھڑکنے لگا لرزتے ہاتھوں سے اس نے رقعہ لیا اور اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ شام گھر پہنچتے ہی اس نے خط کھولا! یہ کیا؟ زندگی کی ڈھلتی شام کی مانگ سنوارنے کے لئے روشنی کی یہ کرن کہاں سے چلی آئی؟ جوانی کی شبنم کا ایک قطرہ جو اس نے وقت کے سمندر میں گنوا دیا اسے کس طرح ڈھونڈ کر لائے زندگی میں تلخیاں اس قدر گھل گئی تھیں کہ شہد کا ایک قطرہ بھی اسے کڑوا معلوم ہو رہا تھا۔ خط میں لکھا تھا۔

محترمہ ثمینہ صاحبہ

آداب عرض۔ آپ میرا یہ خط دیکھ کر حیران ہوئی ہونگی لیکن میں آپ کے لئے کوئی اجنبی نہیں ہوں آج سے پندرہ سال پہلے ایک ہیلت کیئر سنٹر کی وہ شام آپ کو یاد ہوگی جب میرے دوست وسیم نے آپ کے ساتھ زیادتی کی، جاہلانہ رویہ اختیار کیا اور دوسرے دن آپ کو مائیکے بھیج دیا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی والدہ اپنے خاندان کے نام لیوا کی خواہشمند ہیں اور وسیم ان کی خواہش کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا مجھے انتہائی حیرت ہوئی کہ اس حالت میں اس نے آپ کے ساتھ چھ مہینے کا عرصہ کس طرح گزارا میرے استفسار پر بتایا کہ آپ بے حد معصوم اور کمسن ہیں اسی لئے کسی قسم کا احتجاج نہیں کیا ماں کی خواہش کے پیش نظر اپنی پول کھل جانے کے ڈر سے اسے پریشانی لاحق ہو گئی کہ آپ کے لوگ اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہ کر بیٹھیں اور وہ عورت، عزت، دولت و جائیداد سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے۔ اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس کی شیطانی اسکیم میں اس کا ساتھ دوں۔ میں شیطان کے بہکاوے میں آگیا اور آپ جیسی معصوم

و پاکباز خاتون کے ساتھ انسانیت سے گری ہوئی حرکت کر بیٹھا۔ جب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا تب تک آپ والدین کے ساتھ شہر چھوڑ کر جا چکی تھیں میں نے آپ کو بہت تلاش کیا لیکن ناکام رہا۔ تین دن قبل آپ کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ آپ اگر برا نہ مانیں تو ایک درخواست کروں کہ میں آپ کو ایک سکھی جیون دینے کا آرزومند ہوں اپنی غلطی کی تلافی چاہتا ہوں گو کہ آپ کی زندگی کے گزرے ماہ و سال واپس نہیں لا سکتا لیکن اپنی باقی زندگی آپ کے لئے وقف کر سکتا ہوں میں نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے آپ نے میری درخواست قبول کر لی تو سمجھونگا کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا۔

آپ کا بہی خواہ

مجیب

شام غم کی قسم

یہ بے کسی کے اندھیرے ذرا تو ڈھلنے دے
بجھا نہ دے مرے دل کا چراغ جلنے دے
نہ سن سکے تو یہیں ختم ذکر غم کردوں
جو سن سکے تو میری داستاں چلنے دے

تم کیا جانو ان دو سالوں میں، میں کیا سے کیا ہو گئی ہوں موم کی طرح پگھل رہی ہوں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر رہی ہوں صدیوں کی تنہائی کا کرب جھیلتے ہوئے میرا ہر جذبہ ہر احساس مجروح ہو چکا ہے روحانی اضطراب پر قابو پانے کے لئے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لب سی لئے تھے لیکن آج یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے زخم کا ہر ٹانکا ٹوٹ گیا ہے ـــــــــ

شام کا دھندلکا گہرا ہوتا جا رہا تھا پرندے اپنے اپنے بسیروں کی طرف محو پرواز تھے راحیلہ اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی ہوئی دور خلاؤں میں گھور رہی تھی۔اس کے ہاتھ میں ظفر کا خط تھا اس نے لکھا تھا کہ وہ اگلے ماہ عید پر آرہا ہے پچھلے دو سال سے وہ یہی بات لکھتا رہا ہے۔سمندر پار جانے والے کیا جانیں کہ ایک برہن انکی یادوں کے الاؤ میں کس طرح ایک کچی لکڑی کی مانند جلتی رہتی ہے وہ آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے گھور رہی تھی۔کالی گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آرہی تھیں جیسے ابھی برس پڑیں گی۔ آج پھر کسی نے طلعت محمود کی مشہور زمانہ غزل کی دھن بانسری پر چھیڑ دی تھی شام غم کی قسم آج غمگیں ہیں ہم آبھی آبھی جا آج میرے صنم۔بھیگا بھیگا موسم، ظفر کی یاد اور درد میں ڈوبی ہوئی بانسری کی دھن! وہ نڈھال ہوئی جارہی تھی۔شادی کے صرف ایک ماہ بعد وہ سعودی چلا گیا اور وعدہ کیا تھا کہ ایک سال بعد لوٹ آئے گا لیکن تین سال گزر جانے پر بھی وہ نہیں آیا تھا۔

راحیلہ کی ماں اس کی شادی کے لئے کس قدر پریشان تھی۔پاس پڑوس کی عورتیں، رشتے دار اور سہیلیاں اپنے اپنے بیٹوں یا بھائیوں کے لئے راحیلہ کو بے حد پسند کرتی تھیں۔کھلتا ہوا چمپئی رنگ، ستواں ناک، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، موتیوں جیسے دانت اور سرو جیسا قد۔مرمریں جسم کا ہر زاویہ دلکش تھا۔راحیلہ ایک ہی نظر میں ہر کسی کو بھا جاتی لیکن انکے ہاں گھوڑے جوڑے کے نام پر دینے کیلئے نوٹوں کے انبار نہیں تھے اور نہ ہی نئے ماحول اور خیالات کے مطابق جہیز تھا۔اس لئے راحیلہ کی ماں نے اسے ظفر کے حوالے کر دیا تھا۔ان لوگوں کی کوئی مانگ نہیں تھی وہ اس بات کو پسند نہیں کرتی تھی کہ شادی کے چند دن بعد ہی دولہا سات سمندر پار کولہو کے بیل کی طرح پسنے چلا جائے اور نئی نویلی دلہن سونی سیج سجائے بیدرد سناٹوں کی آغوش میں پڑی سسکتی رہے پھر آپ ہی سوچتی کہ چلو باہر جانے سے روٹی کا تو سہارا ملا ورنہ یہاں ملازمت کب ملتی اور مل بھی جاتی تو کسی معمولی عہدہ پر کام کرنا پڑتا اور آمدنی بندھی ٹکی ہوتی۔

عید کا دن آگیا ہر سال کی طرح ظفر کو نہ آنا تھا نہ آیا چاروں طرف خوشیاں بکھری پڑی تھیں لیکن راحیلہ کے دل پر اداسیوں کا راج تھا۔وہ کسی کام سے بڑے بھیا

کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ بھابی اپنے مہندی رچے ہاتھوں سے بھیا کو شیر خرما پلارہی ہیں پھر وہ سرمہ دانی دینے کیلئے چھوٹے بھیا کے کمرے میں گئی تو دیکھا وہ بھابی کے بالوں میں پھولوں کا خوبصورت گجرا لگا رہے تھے راحیلہ پر نظر پڑی تو اس کے ہاتھ میں دو گجرے تھما دیئے۔ راحیلہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں وہ تیزی کے ساتھ پلٹی اور اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گئی اس کے بیڈ پر ظفر کا خط اور عید کارڈ پڑے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔اس نے الماری سے لیٹر پیڈ نکالا اور بیٹھ گئی اس کا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔

"تم کیا جانو ان دو سالوں میں، میں کیا سے کیا ہو گئی ہوں موم کی طرح پگھل رہی ہوں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر رہی ہوں صدیوں کی تنہائی کا کرب جھیلتے ہوئے میرا ہر جذبہ ہر احساس مجروح ہو چکا ہے روحانی اضطراب پر قابو پانے کے لئے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لب سی لئے تھے لیکن آج یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے زخم کا ہر ٹانکا ٹوٹ گیا ہے شادی ایک معاہدہ ہے جسکے بعد ہر جوان لڑکی محبت اور خوشیوں سے بھری زندگی کا تصور لئے اپنے دیوتا کے مندر میں قدم رکھتی ہے۔ تم سے شادی کے بعد میں نے بھی نیلے آسمانوں کی تمام تر وسعتوں کو اپنی باہوں میں سمیٹ لینا چاہا تھا۔ تمہاری دی ہوئی لمحاتی رفاقت کو میں نے دائمی سہارا سمجھ لیا اور زمین پر جنت بسانے کی آرزو لئے بیٹھی تھی۔ میرے خوابوں خیالوں کی تمام رنگینیاں تمہارے وجود میں مجسم ہو گئی تھیں۔ لیکن آج میری روح کے اندر ویرانی کا راج ہے آج دنیا میری نظر میں ایک تاریک قفس بن گئی ہے ہر شئے اجنبی سی لگ رہی ہے اور میں ان اجنبی چہروں کے درمیان معلق اور مصلوب ہو کر رہ گئی ہوں میں کیا کروں ۔۔۔

راحیلہ کو بانسری کی آواز نے چونکا دیا کم بخت نے عید کا دن بھی نہیں چھوڑا بانسری رو رہی تھی شام غم کی قسم آج تنہا ہیں ہم وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بالکنی میں آگئی پہلی بار بانسری بجانے والے کو دیکھ رہی تھی وہ آنکھیں بند کئے اپنی ہی دھن میں مست تھا۔ جیسے کوئی پجارن اپنے دیوتا کی پوجا میں مگن ہو۔ اسے کیا دکھ تھا اس کے من مندر کی دیوی کون ہوگی کہاں ہوگی وہ بانسری پر صرف یہی دھن کیوں بجاتا ہے آج وہ بھی اسی دھن کو جی بھر کر سننا چاہتی تھی۔ اس کے اندر کہیں ٹوٹ پھوٹ سی ہونے لگی اچانک اس کے دل نے سرگوشی کی یہ تو نے بڑی بوڑھیوں جیسا حلیہ کیوں

بنا رکھا ہے تجھے جس نے بھلا دیا تو بھی اسے بھلا دے زندگی ایک بار ملتی ہے اور زندگی میں جوانی ایک ہی بار آتی ہے۔ ہر کسی کو اپنی زندگی اور جوانی پر اختیار ہے کہ وہ ان پھولوں کی ہر پتی سے مسرت و شادمانی کا امرت رس نچوڑ لے سوچ کیا رہی ہے؟

ضمیر کے کسی کونے سے آواز آئی نہیں نہیں!" میں تجھے آزاد ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا مجھے تیری نگہبانی کے لئے پیدا کیا گیا ہے دل کہتا"

"کب تک تنہائی کے اس لق و دق صحرا میں بھٹکتا رہوں کب تک فراق کی ان خاردار جھاڑیوں سے الجھتا رہوں؟ ضمیر نے کہا اس راستے پر چلنے کے لئے کیوں مچل رہا ہے جس پر چل کر راہی منزلوں سے بھٹک کر دور کہیں اندھیروں میں کھو جاتے ہیں لپنے جسم کے قفس میں قید تو ایک مشرقی روح ہے تو کسی کی امانت ہے عزت اور شرافت کے دار پر چڑھ جا" آپ اپنا گلہ گھونٹ لے کہ یہی ایک شریف لڑکی کا شیوہ ہے" عقل اور دل کی جنگ کے درمیان راحیلہ کی روح کے سناٹے چیخ پڑے وہ دوڑتی ہوئی لپنے کمرے میں گئی دروازے اور کھڑکیاں بند کئے اور اپنی شادی کا البم لیکر بیٹھ گئی وہ تصویریں دیکھتی رہی اسکی آنکھوں سے جھرنے بہہ رہے تھے وہ روتے روتے ہنس پڑی اور ہنستے ہنستے رونے لگی پھر اچانک چلا اٹھی ظفر تم کہاں ہو؟ کہاں ہو ظفر؟ ظفر! وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی اور چلاتی ہوئی پورے گھر میں اسے تلاش کر رہی تھی گھر کے لوگ حیران پریشان اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کسی نے پوچھا کہاں دیکھا ہے تم نے ظفر کو؟ وہ ابھی ابھی میرے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کیا آپ لوگوں نے نہیں دیکھا؟ کہاں چلے گئے وہ؟ راحیلہ کی سوجی ہوئی آنکھوں سے وحشت سی برس رہی تھی ظفر کی بہن نے اسے پکڑ کر جھنجھوڑا اور کہا ظفر آیا ہی کب تھا؟ کیا دیوانی ہو گئی ہو؟ دیوانی؟ ہاں میں دیوانی ہو گئی ہوں پاگل ہو گئی ہوں مجھے مارو جلا دو سنگسار کر دو! ظفر کہاں ہو میرے سامنے آؤ اتنے تو سنگ دل نہ بنو تم نے مجھے محبت کے جذبہ سے آشنا کیا اور میں نے تمہیں اپنا مسجود بنا لیا تمہاری محبت کے سائے میں جینا چاہتی تھی گھونٹ گھونٹ کر زندگی کا امرت رس پینا چاہتی تھی۔ تم نے مجھے تشنہ لب چھوڑ دیا میرے وجود میں چنگاریاں بھر دیں جدائی کے ریگستان میں تنہا چھوڑ دیا اب میں کہاں جاؤں؟ تمہیں کہاں ڈھونڈوں؟ آ بھی جاؤ ظفر آ جاؤ نا! وہ ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی اور بانسری کی دھن اس کی آواز میں مدغم ہو رہی تھی = شام غم کی قسم آج تنہا ہیں، ہم آ بھی جا آ بھی جا آج میرے صنم!!

فیصلے کی رات

ناخدا بے خود فضا خاموش ساکت موج آب
اور ہم ساحل سے تھوڑی دور پر ڈوبا کیے
مختصر یہ ہے ہماری داستان زندگی
ایک سکون دل کی خاطر عمر بھر تڑپا کیے

کہتے ہیں کہ ہر انسان کی زندگی میں کچھ پر کیف سے لمحات ضرور آتے ہیں جن کے سرور ولذت کو وہ اپنے وجود کے اندر جذب کر لینا چاہتا ہے۔ تم میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے مجھ سے مخاطب تھے یہ سب کچھ مجھے اچھا معلوم ہو رہا تھا دل چاہتا تھا کہ وقت کی رفتار تھم جائے میں تمہیں دیکھتی رہوں تمہیں سنتی رہوں اچانک ہی تمہاری پرسوز نگاہوں کی تپش سے میرے اختیاری جبر کا بت پگھلنے لگا خرد نے کسی کونے سے آواز دی ہوش میں آ تجھے یہ جنوں زیب نہیں دیتا اسی وقت تم نے........

سفینہ کی نظر جیسے ہی رفیق پر پڑی وہ دروازے کی اوٹ میں ہو گئی پھر جھک کر دیکھا۔ ہاں وہی ہیں لیکن کتنے بدل گئے ہیں کنپٹیوں پر سفید بال چمک رہے ہیں آنکھوں میں وہی سوز ہونٹوں پر وہی اداس سی مسکراہٹ اور چال میں وہی آن بان۔ رفیق کو وہ پچھلے دس برسوں میں کوشش کے باوجود لمحہ بھر کے لئے بھی نہ بھلا سکی تھی

آج سفینہ نے اپنی بیٹی اسماء کی سالگرہ اعلی پیمانے پر منانے کا اہتمام کیا تھا کیونکہ اسی سال اس نے میٹرک درجہ اول میں پاس کیا تھا۔ سفینہ کے بار بار منع کرنے کے باوجود تقریب کا سارہ خرچ اور انتظام اس کے اسکول کے ڈائرکٹر حسن جاوید نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا وہ ان کے اسکول میں پرنسپل تھی۔ آج اس تقریب میں رفیق کو دیکھنے کے بعد اس کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ وہی رفیق جسے پہلی بار دیکھتے ہی سفینہ کی خرد کے کواڑ اپنے آپ بند ہو گئے اور وہ دیوانگی کا ہاتھ تھامے اندھیرے راستوں پر چل پڑی تھی۔ رفیق اسماء کی سہیلی رعنا کے ساتھ گیٹ میں داخل ہوئے وہ صدر دروازہ کے قریب پہنچ گئے تھے۔ سفینہ جو مہمانوں کا استقبال کر رہی تھی تیزی کے ساتھ اپنے بیڈروم میں چلی آئی اور دروازہ بند کر لیا۔ یادوں کے ہجوم نے اسے گھیر لیا۔

اسٹینو ٹائپسٹ کے انٹرویو کے لئے جب میں تمہارے ڈیٹکٹیو آفس میں آئی تو کچھ مرد و خواتین وہاں پہلے سے موجود تھے میرا نمبر آخری تھا نام پکارنے پر جب میں اندر آئی تو دیکھا کہ ایک میز کے دونوں سروں پر دو آفیسرز اور درمیان میں تم بیٹھے ہوئے تھے میں چند لمحوں کے لئے تمہاری پر کشش شخصیت میں کھو گئی۔ سحر زدہ سی ہو گئی جیسے صدیوں سے مجھے تمہاری ہی تلاش تھی کتنی معصومیت تھی تمہارے چہرے پر تم مجھے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی کمسن بچہ اپنے من پسند کھلونے کو دیکھتا ہو۔ تمہاری آنکھوں میں ایک سوز اور ہونٹوں پر سوگوار سی مسکراہٹ تھی۔ میں تمہارے سوالوں کے جواب کھوئے کھوئے انداز میں دیتی رہی تم نے پوچھا "آپ نے کہاں تک تعلیم پائی ہے؟" "جی میں نے بی۔اے کیا ہے" "پہلے بھی کہیں کام کیا ہے؟" "جی ہاں میں ٹیچر ہوں" "موجودہ ملازمت کیوں چھوڑنا چاہتی ہیں؟" میں خاموش رہی "آپ کیا تنخواہ چاہتی ہیں؟" "یہ تو وقت اور کام پر منحصر ہے؟" کیا آپ کو جاسوسی کے کام سے دلچسپی ہے؟

"جی ہاں بہت ہے" "آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟" "وہ گزر چکے ہیں وہ زمیندار تھے" "کتنے بچے ہیں؟" "ایک لڑکی ہے" "والدین ہیں؟ جی نہیں۔ میں اپنے سوتیلے بھائی اور بھابی کے ساتھ رہتی ہوں" "ٹھیک ہے آپ باہر بیٹھیں ایک گھنٹہ انتظار کے بعد تم نے مجھے اپوائنٹ منٹ لیٹر دیدیا وہ ایک گھنٹہ میری ساری زندگی پر محیط ہو گیا۔ رات کے پچھلے پہر ہی سے میں آفس آنے کی تیاری شروع کر دیتی اور سب سے پہلے پہنچ جاتی۔ تم وقت کے بڑے پابند تھے صفائی تمہیں بہت پسند تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں سارے آفس کی صفائی اپنے ہاتھ سے کر دیتی آہستہ آہستہ میں نے آفس کا حلیہ بدل کر رکھ دیا لیکن تم نے یہ سب کچھ پسند کیا تھا یا نہیں اس بات کا مجھے اندازہ نہ ہو سکا کیونکہ کام سے ہٹ کر تم کسی سے کوئی بات نہ کرتے تھے۔ کسی نے تمہیں مسکراتے بھی نہیں دیکھا تھا صبح ٹائم پر آفس آجاتے اور شام ہونے پر ہی اپنے کمرے سے باہر نکلتے تمہاری شخصیت مجھے شرلاک ہومز کی طرح پراسرار سی لگتی۔ میں تمہیں دیکھنے کی منتظر رہتی صبح اور شام کا انتظار صرف تمہیں دیکھنے کیلئے کرتی رہتی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے کیا ہو رہا ہے یہ کونسا جذبہ ہے جس نے مجھے ہر چیز سے بے نیاز کر دیا ہے دید کی طلب کے اس جذبے کا نام کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہے؟ میری بے تاب نظروں کا راز اگر طشت از بام ہو جائے تو کیا ہو گا میں نے تو اپنے جذبات و احساسات کے خزانے کو ایک کال کوٹھڑی میں بند کر دیا تھا۔ تم ایک داستانوی شہزادے کی مانند میری ویران دنیا میں کہاں سے آگئے اور اس کال کوٹھڑی پر کیوں دستک دے رہے ہو جسے مقفل کر کے میں نے اسکی کنجی بھی کسی سمندر میں پھینک دی ہے۔ میری زندگی کا چاند تو گہنا گیا میں نے اجالوں کی تمنا ہی چھوڑ دی تھی پھر یہ رنگ و نور کی کہکشاں سی میری راہوں میں کیوں بکھر رہی ہے میں تو ایک خالی سیپ کی مانند ہوں ایک تیس سالہ بیوہ جس کے سامنے اسکی ایک لڑکی کا مستقبل بھی ہے۔ میری ذرا سی لغزش بدنامی و رسوائی کے گہری کھائی میں ڈھکیل سکتی ہے۔ بارہا سوچا کہ استعفیٰ دیدوں اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش میں دو دو دن غیر حاضر ہو جاتی لیکن تیسرے دن بے تاب و بے حال دوڑی چلی آتی۔ دن گزر رہے تھے چند ماہ بعد تم نے مجھے جاسوسی کے کیس دینا شروع کئے مجھے اپنے کمرے میں بٹھا کر کیس سمجھاتے۔ جب تک تمہارے

سامنے بیٹھی رہتی کان تمہارے الفاظ پر اور نظر تمہارے چہرے پر مرکوز رہتی ہیں کیسس کو خوش اسلوبی کے ساتھ سلجھاتی رہی اور خود الجھتی چلی گئی تم میرے کام سے مطمئن معلوم ہوتے تھے ایک انجانا سا اطمینان مجھے بھی محسوس ہوتا تھا وہ دن مجھے آج بھی یاد ہے جیسے کل ہی کی بات ہو آسمان پر گھٹائیں چھا رہی تھیں ماحول پر ایک سکوت سا طاری تھا ایسا سکوت جو کبھی کبھی کسی طوفان کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ شام کے چار بج چکے تھے ایک اہم کیس کے سلسلہ میں تم نے مجھے بلایا اور آفس ٹائم کے بعد اپنے ساتھ چلنے کہا۔ تمہاری قربت کے خیال ہی سے میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو سی ہو رہی تھیں۔ میرے اندر سلگتی آگ کی حرارت کو اگر تم نے محسوس کر لیا تو کیا ہوگا۔ اپنے احساسات و خیالات سے میں تمہیں آگاہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے تم سے محبت تھی بس، روحانی محبت، جسے میں ایک طرفہ ہی رکھنا چاہتی تھی۔ اکیلی فنا ہو جانا چاہتی تھی کیونکہ اس فنا میں مجھے اپنی بقا نظر آتی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں کانپتی لرزتی تمہاری گاڑی میں بیٹھ گئی راستہ بھر ہم نے کوئی بات نہیں کی۔ تم مجھے اپنے اس گھر میں لے گئے جو زیر تعمیر تھا تمہارا چوکیدار حیرانی سے دیکھ رہا تھا تم نے بتایا کہ مزدوروں کی نگرانی کے بہانے وہاں ٹھیر کر سامنے والے گھر کی مالکہ کی حرکات و سکنات پر نظر رکھوں جو ایک ہیلتھ کیئر سنٹر چلا رہی تھی جہاں مرد و خواتین کا تانتا بندھا رہتا۔ اس کا شوہر ملک سے باہر ملازمت کرتا تھا۔ تم نے چوکیدار کو ناشتہ اور چائے لانے کہا۔ پہلی بار تم نے کام سے ہٹ کر کوئی بات کی تھی۔ میرا دل اچھلنے لگا۔ کہتے ہیں کہ ہر انسان کی زندگی میں کچھ پر کیف سے لمحات ضرور آتے ہیں جنکے سرور و لذت کو وہ اپنے وجود کے اندر جذب کر لینا چاہتا ہے تم میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے مجھ سے مخاطب تھے یہ سب کچھ مجھے اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ وقت کی رفتار تھم جائے میں تمہیں دیکھتی رہوں تمہیں سنتی رہوں۔ اچانک ہی تمہاری پرسوز نگاہوں کی تپش سے میرے اختیاری جبر کا بت پگھلنے لگا خرد نے کسی کونے سے آواز دی ہوش میں آ! تجھے یہ جنون زیب نہیں دیتا۔ اسی وقت تم نے میرے ہاتھ کو اپنے مضبوط اور تپتے ہوئے ہاتھ کی گرفت میں لے لیا جسکی تپش میرے وجود کے اندر اترنے لگی۔ تم نے میری کال کوٹھڑی کے قفل کو کھول دیا۔ میں نے تمہیں معصوم

شہزادہ سمجھا تھا اپنی سجدہ گاہ میں تمہیں بٹھالیا تھا میں اپنے جنون کے سہارے مقام آگہی کو پالینا چاہتی تھی۔ تم نے یہ کیا کر دیا؟ محبت کی موم بتی کو پگھلا کر قطروں میں بہادیا! تم بھی عام مردوں کی طرح نکلے میرے بھرم کو پامال کر دیا! اب کیا ہوگا؟ میں کیا کروں! تم سے لمحہ بھر کی فرقت برداشت نہیں کر سکتی اور تم مجھے عمر بھر کی رفاقت دے نہیں سکتے۔ کیونکہ تم ایک شادی شدہ مرد ہو۔ ایک کنبہ کے سرپرست ہو۔ تمہارا اپنا ایک سماجی مقام ہے اور میں ایک بیوہ۔ بیوہ کی شادی کو ہمارے سماج میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس کے جذبات واحساسات کو پند و نصیحت کی وزنی سلوں تلے دبا دیا جاتا ہے پھر بھی اس پر الزام لگائے جاتے ہیں کہ یہ بیوہ یا مطلقہ عورتیں ہمارے معاشرہ کے چہرہ پر ایک بدنما داغ ہیں۔ جان بوجھ کر اس بات سے چشم پوشی کی جاتی ہے کہ عمر کے ہر حصہ میں عورت کے لئے ایک مرد کا سہارا ضروری ہوتا ہے۔ کسی گھر کے لئے چھت کا ہونا لازمی ہے۔ دوسرے دن میں نے اپنا استعفیٰ بھیج دیا اپنے آپ کو سنبھالنے میں بہت وقت لگا پھر مجھے ایک اسکول میں ملازمت مل گئی۔ اسی اسکول کے ڈائرکٹر حسن جاوید مجھے مجبور کرتے رہے ہیں کہ وہ میری بیٹی اسماء کو باپ کا پیار دینا چاہتے ہیں انہوں نے اسماء کی سالگرہ کے دن میرا فیصلہ مانگا ہے آج کی رات فیصلہ کی رات ہے اور آج برسوں بعد تم کہاں سے چلے آئے۔ میرے دماغ میں آندھیاں چل رہی ہیں سینے سے دھواں سا اٹھ رہا ہے آنکھوں کے آگے دھند سی چھا رہی ہے میں کیا کروں دل کی وحشت بڑھتی جا رہی ہے میرے خدا مجھے ہمت دے ــــــ

کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ سفینہ نے لڑکھڑاتے قدموں سے جا کر دروازہ کھولا اسکی بیٹی اسماء اسے تلاش کرتی ہوئی آئی تھی۔ "می کیا ہوا؟ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ مہمان آپ کا انتظار کر رہے ہیں جاوید انکل بار بار پوچھ رہے ہیں اور ہاں رعنا کے ڈیڈی رفیق انکل بھی آپ سے ملنا چاہتے ہیں چلئے نا! می آپکی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟

"ہاں بیٹا ٹھیک ہوں سر میں درد ہو رہا تھا تم چلو میں ابھی آرہی ہوں"۔ سفینہ نے منہ دھو کر ہلکا سا میک اپ کیا اسکی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اسی وقت حسن جاوید بھی آگئے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے لے گئے تمام مہمان میز کے

اطراف جمع تھے تالیوں کے شور میں اسماء نے کیک کاٹا مبارک مبارک کی صدائیں بلند ہوئیں سفینہ کی نظر رفیق پر پڑی جو والہانہ انداز میں اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سفینہ کی نظران پر جم سی گئی اور چند لمحوں بعد وہ بے ہوش ہو چکی تھی ۔۔۔ رفیق بے ساختہ اس کی طرف بڑھے حسن جاوید بھی قریب آگئے کچھ دیر بعد ڈاکٹر کمال ۔۔ نے بتایا کہ بے ہوشی شدید صدمہ اور سوچ کا نتیجہ ہے جلد ہی ہوش آجائے گا۔ انہوں نے انجکشن لگا دیا تھا۔ آدھ گھنٹہ بعد سفینہ کو ہوش آیا وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی سب لوگ خاموش تھے اسماء رو رہی تھی رفیق بھی اس کے قریب بیٹھے ہوئے تھے وہ انہیں دیکھتی رہی پھر پوچھا "کیا بجا ہے ؟آپ گھر نہیں گئے ؟ رفیق نے بہ آہستگی کہا" سفینہ مجھے خوشی ہے کہ برسوں بعد پھر تم سے ملاقات ہوئی میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں تم برا تو نہیں مانو گی سفینہ تم جب پہلی بار میرے آفس آئی تھیں اسی دن تمہیں اپنانے کی تمنا نے میرے دل میں گھر کر لیا تھا۔ تمہیں اپنی سمجھنے لگا تھا تمہارے استعفیٰ سے ایک دن پہلے میں بہک گیا تھا دوسرے دن تم سے معافی مانگنا اور تمہارا ہاتھ تھام لینا چاہتا تھا اس دن تم نہیں آئیں دو چار دن انتظار کرنے کے بعد تمہارے گھر گیا تو معلوم ہوا تم کہیں اور منتقل ہو چکی ہو اور آج " ۔۔۔۔ رفیق خاموش ہو گئے ۔ حسن جاوید دودھ کا گلاس لئے آگئے تھے اور سفینہ کو سہارا دے کر اٹھانے لگے رفیق بھی آگے بڑھے اور اسی وقت سفینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

انتقام

چالاک دنیا ، عیار دنیا ، بدخلق دنیا ، بدکار دنیا
خونریز دنیا ، خونخوار دنیا حرص و ہوس کی دلدار دنیا
کچھ کہہ رہی ہے کچھ کہہ رہی ہے دنیا یہی ہے دنیا یہی ہے

مرد فطرتاً سخت گیر واقع ہوا ہے عورت کو اپنے قدموں میں روتا گڑگڑاتا دیکھ کر اس کی انا کو تسکین ملتی ہے لیکن آج ایک عورت کی انا جاگ اٹھی تھی عورت جب محبت کرتی ہے تو خود زمین بن جاتی اور مرد کو آسمان بنا دیتی ہے اور جب نفرت و انتقام کی آگ میں جلتی ہے تو دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

آج اس کے جسم پر بلیڈ سے کاٹے گئے زخم اور جلنے کے داغ رس رہے تھے۔ وہ مچھروں سے بھری ہوئی کال کوٹھڑی میں زندگی کی گھڑیاں گن رہی تھی۔ موت کہیں پاس ہی کھڑی قہقہے لگا رہی تھی اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا ایک غنودگی سی چھاتی جا رہی تھی۔ سالہا سال سے عورت ہی مرد کے ظلم و جبر کا نشانہ بنتی رہی ہے۔ صبیحہ کے ظالم شوہر نے اسے ننگا کر کے اندھیری کوٹھڑی میں بند کر دیا تھا جہاں مچھروں کا راج تھا۔ وہ گھنٹوں مچھروں سے بچنے کے لئے ہاتھ پیر مارتی رہی تھی تھک ہار کر اس نے اپنے آپ کو مچھروں کے حوالے کر دیا تھا اس میں مدافعت کی سکت بھی نہیں رہ گئی تھی اس کال کوٹھڑی میں بند رہتے دس گھنٹے گزر گئے تھے۔ اس پر غشی طاری ہو چکی تھی۔ یہ کسی مرد کے ظلم کی انتہا تھی۔ خود صبیحہ کی نادانی نے اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا تھا۔

صبیحہ سراج کی زندگی ایک المناک حادثہ تھی۔ وہ اپنے تین بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ اس کے والد گزشتہ دس سال سے سعودی میں ملازمت کر رہے تھے۔ قدامت پسند گھرانہ تھا ماں اور بیٹیاں پردہ کی پابند تھیں۔ ان لوگوں نے نئے شہر میں ایک خوبصورت مکان خرید لیا تھا۔ صبیحہ کی ماں کا میل جول اپنی پڑوسنوں بیگم صمد، بیگم رفیع احمد اور بیگم صالحہ ظہیر سے بڑھا تو انھیں اپنی قدامت پسندی کھلنے لگی وہ ان سب کے رکھ رکھاؤ اور رہن سہن کو رشک و حسد کی نظر سے دیکھا کرتی اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنے لگی سب سے پہلے اس نے اپنے بچوں کے لئے نت نئے فیشن کے کپڑے بنائے خود اپنے لئے نئی ساڑیاں سینڈل اور میک اپ کا سامان خریدا۔ گھر کے در و دیوار کو نیا رنگ و روغن کروایا اور اعلیٰ فرنیچر سے آراستہ کیا۔ آنگن میں بھی نئے پھول پودے اپنی بہار دکھانے لگے۔

اس دن صبیحہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی جس دن وہ اپنا برقعہ پھینک کر اپ ٹو ڈیٹ بن کالج میں داخل ہوئی بالوں کا اسٹائل اور چال ڈھال بھی بدل گئے تھے برقعہ اور اسکول کی گھٹی گھٹی فضا سے نکل کر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ دنیا کتنی خوبصورت ہے ڈھیر ساری رنگینیاں چاروں طرف بکھری پڑی تھیں اسے بے اختیار اپنی ممی پر پیار آ رہا تھا جنھوں نے ابوجی کو ڈیڈی بنا دیا اور ان سب کو نئے زمانے کے

سانچے میں ڈھال دیا تھا اور ڈیڈی تو ہر بات میں ممی کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے ہیں یہ چھوٹا سا قافلہ نئی راہوں پر رواں دواں تھا اور زندگی محو رقص تھی ۔ صبیحہ نے بی ۔ ایس ۔سی پاس کر لیا طاہرہ اور شکیل نے بھی انٹر اور میٹرک کر لیا ۔اسی اثنا میں صبیحہ کے لئے ڈاکٹر شفیع کا پیام آیا ان کی والدہ اور دو تین بہنیں آئیں اسے پسند کیا اور منہ میٹھا کر کے چلی گئیں سجاد صاحب نے پہلے تو انکار کیا ۔ان کا خیال تھا کہ ان کی نازوں سے پالی لڑکی ایک بڑے کنبہ کو نہ سنبھال سکے گی ۔ لیکن بیگم سجاد کب ماننے والی تھیں شفیع کی ایم ۔بی ۔بی ۔ایس کی ڈگری اور زیبنات و مکانات کی چمک دمک نے آنکھوں کو چکا چوند کر دیا تھا ۔ وہ اپنی ضد میں کامیاب ہو گئیں بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی جب صبیحہ نے دلہا کو قریب سے دیکھا اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی ۔ شفیع ایک دبلا پتلا اوسط قد اور کھوئی کھوئی سی آنکھوں والا تیس بتیس سالہ شخص تھا ۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اسکی مسہری کے قریب آیا اور سلام علیکم کہہ کر کچھ دیر تک خاموش رہا صبیحہ جواب دینے کے بجائے کچھ اور سمٹ گئی ۔ شفیع نے بیٹھتے ہوئے کہا " شاید آپ نے مجھے اپنی پسند کے مطابق نہ پایا ہو لیکن میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ ایک تعلیم یافتہ اور خوبصورت لڑکی میری زندگی کی ساتھی ہے " صبیحہ کے دل کا چور پکڑا گیا لیکن وہ اپنی تعریف سن کر عام لڑکیوں کی طرح خوش ضرور ہوئی وہ سوچ رہی تھی پسند کے مطابق نہ ہوتے ہوئے بھی وہ پیار کئے جانے کے قابل ہے شفیع کے شائستہ اور نرم لب و لہجہ نے اس کے دل کو چھو لیا تھا ۔ اس نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا اور زندگی ایک ڈگر پر چل پڑی ۔ آہستہ آہستہ صبیحہ نے محسوس کیا کہ وہ پھر ایک بار گھٹے گھٹے سے ماحول میں گھر گئی ہے گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا اسے شعور تھا نہ شوق ۔ آزاد پنچھی کی طرح کھلی ہواؤں میں اڑنا اسے مرغوب تھا وہ چاہتی تھی کہ شفیع بھی اس کے پسندیدہ مشاغل میں حصہ لے ۔ زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ باہر گھومتا رہے فائیو اسٹار ہوٹل میں کبھی لنچ ہو تو کبھی ڈنر ہو ۔ اس کے برخلاف شفیع بے حد سنجیدہ مزاج تھا انسانی ہمدردی اور خلوص سے اس کا دل معمور تھا وہ زیادہ وقت مریضوں کے ساتھ گزارتا اور رات کا کچھ حصہ صبیحہ کے لئے تھا ۔ جس پر وہ کبھی سخت ناراض ہوتی کبھی پیار سے سمجھاتی لیکن شفیع اپنی فطرت سے مجبور تھا

صبیحہ اپنی ہی آگ میں سلگتی رہی۔

ایک دن اس کی سہیلی ثمینہ کا فون آیا تو وہ کھل اٹھی اسے فوراً اپنے گھر آنے کہا۔ آدھ گھنٹہ کے اندر ثمینہ اپنی نئی کار ڈرائیو کرتی ہوئی پہنچ گئی۔ دونوں میں خوب باتیں ہوئیں۔ ثمینہ نے بتایا کہ اس کا شوہر لکڑی کا کاروبار کرتا ہے جس سے انہیں کافی آمدنی ہوجاتی ہے پانچ سال کے اندر انہوں نے ایک خوبصورت وسیع مکان بنوالیا اس نے یہ بھی بتایا کہ عام شوہروں کی طرح وہ اس سے صرف پیار کی باتیں نہیں کرتے بلکہ اس پر بے حساب رقم بھی خرچ کرتے ہیں اس کی ہر خواہش وخوشی کا خیال رکھتے ہیں۔ صبیحہ کو ثمینہ کی زندگی پر رشک آرہا تھا اس نے اپنی محرومیوں کا رونا رویا تو ثمینہ نے مشورہ دیا کہ وہ چند دنوں کے لئے اپنے مائیکے چلی جائے تب اس کے میاں جی کا دماغ ٹھیک ہوجائے گا۔ دوپہر کے کھانے اور چائے کے بعد ثمینہ تو چلی گئی لیکن صبیحہ کو نئی الجھنیں دے گئی۔ وہ آرزوئیں جو ازل سے ایک عام عورت کی کمزوری رہی ہیں وہ سب کی سب جاگ پڑیں اسے اچانک ہی زندگی میں کئی چیزوں کی کمی محسوس ہونے لگی۔ آج وہ وقت سے پہلے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ریڈیو اور ٹی وی سے اس کے بے قرار دل کو قرار نہ ملا۔ آخر رات گیارہ بجے شفیع آئے اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی شفیع اسے محبت سے سمجھاتے رہے صبیحہ نے موقع دیکھ کر کہا "آج میں آپ سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں کیا آپ دینگے ؟" بس میں ہوگا تو ضرور دیں گے کہو تو سہی کیا بات ہے ؟" میری خواہش ہے کہ ہم ایک خوبصورت مکان اور چھوٹی سی کار خرید لیں ان چیزوں کی عدم موجودگی میں مجھے احساس کمتری ہوتا ہے ۔۔۔۔ شفیع نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا" صبیحہ ابھی ان چیزوں کے لئے ہمارے پاس پیسہ نہیں ہے اور ان لغویات میں رکھا بھی کیا ہے رہنے کو ایک مکان اور گھومنے کے لئے ایک اسکوٹر کافی ہیں مجھے مریضوں کی خدمت اور غریبوں کی مدد کرکے خوشی ملتی ہے پھر بھی تمہاری خواہش کا خیال رکھوں گا اور کوشش کروں گا کہ تمہیں یہ سب مہیا کرسکوں، شفیع کے لہجہ میں بے حد نرمی تھی۔ صبیحہ نے کروٹ بدلی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

دوسرے دن شفیع کو اس کی سہیلی کی آمد اور تمام باتوں کا علم ہوا تو اس نے صبیحہ پر پابندی لگادی کہ وہ اپنی کسی سہیلی سے نہ ملے صبیحہ دن بہ دن چڑچڑی ہوتی جارہی تھی

گھر کے افراد سے یہاں تک کہ شفیع سے بھی بولنا بند کر دیا۔ اسے اپنی ممی پر غصہ آرہا تھا جس نے اس کی شادی ایم۔بی۔بی۔ایس کی ڈگری کے ساتھ کر دی تھی۔ ایک دن وہ کسی کو بتائے بغیر ماں کے گھر چلی گئی۔ جب اپنی رام کہانی سنائی تو ماں نے اپنا سر پیٹ لیا دو مہینے گزر گئے اس دوران شفیع نے اسے نہیں بلوایا نہ ہی خود آیا۔ ماں کے کہنے پر صبیحہ نے خلع کا مطالبہ کیا جو فوراً پورا کیا گیا۔ صبیحہ کے دل کو ایک دھچکا سا لگا لیکن اس نے جلد ہی سب کچھ بھلا دیا۔ ایک دن صبیحہ کو ثمینہ کا خیال آگیا وہ ملنے چلی گئی اسے محسوس ہوا وہ کسی سرد سے اندھیرے قبرستان سے نکل کر زندہ لوگوں کی بستی میں آگئی ہو اور پھر ثمینہ کے شب و روز ثمینہ کے ساتھ کلبس اور تفریحات میں گزرنے لگے۔ وہ نئی زندگی کی نئی رنگینیوں میں کھو گئی وہ اکثر سیٹھ سراج الدین کے ساتھ دیکھی جا رہی تھی۔ ثمینہ کے ساتھ پہلی بار ان کے مکان گئی تو دنگ رہ گئی مکان کیا تھا اچھا خاصہ عجائب گھر تھا، قدیم طرز پر بنا ہوا سفید وسیع و عریض مکان جسے اندر داخل ہونے کے بعد راستے کے دونوں جانب زرد گلاب کی کیاریاں تھیں پو ٹیکو سے ہوتی ہوئی جب ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی تو اس کی سجاوٹ دیکھ کر حیران رہ گئی نایاب فرنیچر، خوش رنگ پردے، میزوں پر قیمتی گلدان، دیواروں پر آویزاں خوبصورت پینٹنگز اور ایک طرف خوبصورت اکویریم جس میں رنگ برنگی مچھلیاں قید کی ہوئی تھیں صبیحہ نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک شان بے نیازی کے ساتھ بیچ والے صوفہ پر یوں دراز ہو گئی جیسے وہی یہاں کی مالک ہو۔ سراج الدین نے ایک دوا کی کمپنی کھول رکھی تھی۔ اس کی بیوی ان پڑھ تھی اس نے اسے تعلیم دلانے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے تعلیم سے دلچسپی تھی نہ اپنے شوہر کے کاروبار سے کوئی لگاؤ تھا۔ سراج الدین بیوی کے روپ میں ایک تعلیم یافتہ اسمارٹ قسم کے پرسنل سکریٹری کا ضرورت مند تھا صبیحہ سے ملاقات کے بعد اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

بیوی کے کانوں میں بھنک پڑی کہ سراج دوسری شادی کرنے جارہا ہے تو اس نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا اس کے ساتھ گزاری ہوئی محبت کی گھڑیوں کا واسطہ دیا بچوں کی قسمیں دیں لیکن مرد جب اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنے لگتا ہے تو بیوی

کے لئے اس کو مسخر کرنا مشکل ہو جاتا ہے بیوی ان پڑھ ہو تو یہ مشکل سوا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے والدین کے گھر جا بیٹھی۔ سراج کے لئے خس کم جہاں پاک والا معاملہ تھا۔ صبیحہ اس کے من مندر کی دیوی بن گئی۔ کئی دن تک گھر اور کلبس میں پارٹیاں ہوتی رہیں سراج اور مختلف آفیسرز صبیحہ کے نکھرتے حسن اور البیلی جوانی کی دل کھول کر داد دی تو اس نے تصور میں کئی کوٹھیاں اور کاریں خرید لیں سراج ایک شاطر مرد تھا وہ آہستہ آہستہ صبیحہ کو اس راستے پر لانے لگا جس پر چل کر وہ مٹی کو سونا بنا سکتا تھا۔ شروع میں تو صبیحہ نے کوئی خیال نہیں کیا اونچی سوسائیٹی کی روح رواں ہونے کے لحاظ سے خندہ پیشانی سے کام لیا لیکن یار لوگوں کی بڑھتی ہوئی دست درازیوں نے اسے چوکنا کر دیا آج اس کے پاس کوٹھی کار نوکر چاکر سبھی کچھ تھا لیکن روح کے اندر کہیں کانٹا سا کھٹکتا تھا۔ اس نے ایک دن سراج سے کہا "سراج آپ کے دوست خوامخوہ حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں ہم اونچی سوسائیٹی میں اٹھتے بیٹھتے ہیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں کسی کے ہاتھوں میں گیند بن جاؤں"۔ "صوبی ڈیر! اس میں حرج ہی کیا ہے بھئی دیکھو نا بیگم امیر احمد اور بیگم نیرہ عابدی اپنے شوہر کے دوستوں سے کس قدر بے تکلف ہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ شوہر کون ہے اور شوہر کا دوست کون ہے دراصل تم نے ابھی تک سوسائیٹی میں MOVE ہونا سیکھا ہی نہیں ہے" سراج نے سمجھانے کے انداز میں کہا "نہیں نہیں مجھے ایسی سوسائیٹی پسند نہیں جس میں اپنے پرائے کا فرق ہی نہ رہ جائے آپ مجھے اکیلی چھوڑ کر کہیں نہ جایا کریں ورنہ میں کلبس جانا بند کر دونگی" "صوبی تم سمجھنے کی کوشش کرو ذرا سا بے تکلف ہو گئیں تو کونسی قیامت آجائے گی ہمارے کام بن جائیں گے پھر ہمارے پاس کئی کوٹھیاں اور کاریں ہوں گی آگے پیچھے نوکر ہوں گے لوگ تمہیں سر آنکھوں پر بیٹھاتے ہیں اور تم انھیں ٹھکرانا چاہتی ہو یہ کوئی عقل مندی نہیں ہے" "لیکن کار کوٹھیوں کے لئے ضمیر فروشی کہاں تک درست ہے؟" "یہ ضمیر کس واہیات چیز کا نام ہے زیادہ پارسا بننے کی کوشش نہ کرو"۔ "سراج میں نے تمہیں شریف آدمی سمجھا۔" صبیحہ کا لہجہ کرب انگیز تھا۔ "یوں سمجھو کہ تم نے غلطی کی ہے دراصل تمہیں شوہر بدلنے کی عادت پڑ گئی ہے لیکن میں تمہیں آسانی سے چھوڑنے والا نہیں ہوں" سراج کے لہجہ سے بارود کی بو آرہی تھی

"مجھے صاف صاف بتادو کہ تم کیا چاہتے ہو؟ صبیحہ نے بے حد سرد لہجہ میں پوچھا۔" کیا اب مجھے ہی سب کچھ سمجھانا پڑے گا؟ میں جس طرح کہوں اسی طرح کرتی جاؤ بس شرم و حجاب کی فرسودہ رسمیں ہمارے آباء و اجداد کے ساتھ ہی دفن ہو گئیں آج تو جو بھی زیادہ سوشیل اور بے باک ہے اسی کا زمانہ ہے اتنا عرصہ ماڈرن سوسائیٹی میں رہنے کے باوجود تم نری جاہل کی جاہل رہیں"۔" میں تم سے صاف کہہ دیتی ہوں کہ تمہارے کاروبار کی خاطر تمہارے آفیسرس کی تسکین کا سامان نہیں بن سکتی" اسی وقت سراج کا زناٹے دار تھپڑ صبیحہ کے گال پر نشان بنا گیا۔ صبیحہ کی آنکھوں سے آنسو راوں ہو گئے اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اب اس شیطان کے ساتھ کہیں نہیں جائے گی جسے اس نے اپنی عزت و ناموس کا محافظ سمجھ لیا تھا لیکن سراج اس کی کب چلنے دیتا اس ہیرے کو اس نے ہزاروں کے عوض خریدا تھا اسکی تراش خراش پر بھی کافی محنت کی اور اب دنیا کے بازار میں اس کی پوری قیمت وصول کرنا چاہتا تھا۔ صبیحہ سوچ رہی تھی کہ اس نے ایک دن غریب مرد کو ٹھکرایا تھا وہاں ہر چیز کی تنگی تھی لیکن وہ بے وفائی کے داغ تو نہیں لگاتا تھا ایسے ہوتے ہیں شاندار مرد جو بیوی کو ڈیکوریشن پیس بنا کر اپنی شان بگھارتے ہیں اسے ایک کاروباری عورت بنا کر خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مرد فطرتاً سخت گیر واقع ہوا ہے عورت کو اپنے قدموں میں روتا گڑگڑاتا دیکھ کر اس کی انا کو تسکین ملتی ہے لیکن آج ایک عورت کی انا جاگ اٹھی تھی۔ عورت جب محبت کرتی ہے تو خود زمین بن جاتی اور مرد کو آسمان بنا دیتی ہے اور جب نفرت و انتقام کی آگ میں جلتی ہے تو دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ مرد کی دنیا کو تہس نہس کر ڈالتی ہے۔ آج اسے ایک اہم پارٹی میں جانا تھا مگر وہ طئے کئے بیٹھی تھی کہ وہ کہیں نہیں جائے گی۔ سراج نے ظلم کی انتہا کر دی پہلے تو اسے خوب مارا پیٹا پھر اس کے ہاتھ پیر باندھ کر سگریٹ سے جگہ جگہ جسم پر داغ بنائے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر باندھ دیا پھر اسے اندھیری کوٹھڑی میں بند کر کے چلا گیا رات دیر گئے حالت نشہ میں گھر آیا اور سو گیا۔ جب وہ جاگا تو سورج چڑھ آیا تھا اس نے کال کوٹھڑی کا رخ کیا جہاں صبیحہ بے ہوش پڑی تھی ننگے جسم پر بڑے بڑے آبلے ابھر آئے تھے جسم نیلا اور سوجا ہوا تھا۔ سراج نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا اور اسے اٹھا لایا۔ چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے

دیئے اور جسم کو چادر سے ڈھانک دیا۔ کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا آنکھیں سرخ انگارہ سی دہک رہی تھیں وہ آنکھیں بند کئے گزرے حالات پر غور کر رہی تھی۔ ڈرائینگ روم سے باتوں کی آواز آرہی تھی سراج کہہ رہا تھا" وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئی اور اس حالت میں ڈاکٹر سے رجوع کرنا بھی مناسب نہیں ہے" شاید اس کا کوئی دوست آگیا تھا دوسری آواز آئی" سراج اب وہ تمہارے کسی کام کی نہیں رہی وہ اب تمہارے لئے خطرہ بن چکی ہے بہتر ہوگا کہ اسے طلاق دے دو"" میری کافی رقم اس پر خرچ ہو چکی ہے میں سوچوں گا، فی الوقت اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتا ہوں تم شام کو کلب میں ملنا" جیسے ہی سراج بیڈروم میں آیا صبیحہ نے پلنگ سے چھلانگ لگا کر ناچنا اور قہقہے لگانا شروع کر دیئے۔ سراج اسے بھونچکا سا گھورنے لگا ہنسے ہنستے وہ رونے لگی اور روتے ہوئے کہا

" مجھے بھوک لگی ہے کھانا دونا" اس کے بال کھلے ہوئے تھے آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ سراج نے کہا" ابھی لاتا ہوں تم کپڑے تو پہن لو یہ لو تمہارے کپڑے" اس نے کپڑے لئے اور ایک بازو رکھ کر ٹیبل پر جا بیٹھی۔ سراج نے بڑی مشکل سے کپڑے پہنائے اور فریج میں جو کچھ تھا وہ اس کے آگے رکھ دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے جلدی جلدی کھانے لگی اور کھانا ختم کر کے آنکھیں پھاڑے سراج کو گھورنے لگی سراج کو اس سے آنکھ ملاتے خوف آرہا تھا۔ ہمت کر کے اس نے صبیحہ کے بالوں میں ربن باندھا اور اسے تفریح کے لئے چلنے کہا وہ خوشی سے تالیاں بجاتی اس کے ساتھ ہولی۔ گاڑی میں بیٹھی ہوئی وہ بچوں کی طرح تالیاں بجاتی رہی اور سراج کا پاؤں ایکسلیٹر پر دباؤ بڑھا رہا تھا۔ چند منٹوں میں اس کی گاڑی شہر کے پاگل خانہ کے سامنے تھی۔ وہاں کے نگران کار نے صبیحہ کو دو عورتوں کے حوالے کر کے اسے کمرہ نمبر ۱۱ میں لیجانے کہہ دیا۔ کچھ دیر بعد وہ کمرہ نمبر ۱۱ کی سلاخوں کو تھامے بغور اس کے سراپے کا جائزہ لے رہا تھا۔ صبیحہ قریب آئی اور بڑے مؤدبانہ انداز میں اسے سلام کیا۔ نگران کار چونک پڑا صبیحہ نے کہا" جناب میرا نام صبیحہ ہے اور میں سیٹھ سراج الدین کی بیوی ہوں جو ایک دوا کی کمپنی کے مالک ہیں انہوں نے مجھے پاگل سمجھ کر آپ کے حوالے کر دیا ہے۔ دراصل میں ان کے ظلم و تشدد سے تنگ آچکی تھی ان کے چنگل سے زندہ

بچ نکلنا محال تھا اس لئے میں نے پاگل پن کا ڈھونگ رچایا تھا۔ کہئیے کیا آپ کو میرے صحیح الدماغ ہونے میں کوئی شک ہے؟ نگران کار کی آنکھوں سے حیرانی ٹپک رہی تھی اور لب ساکت تھے۔ صبیحہ نے کہا" مجھے آپ اس طرح نہ دیکھیں میں آپ کو ساری تفصیل بتاؤں گی ذرا میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھیں کیا ان میں پاگل پن نظر آتا ہے؟ نگران کار نے اس کے کمرے کا دروازہ کھلوادیا صبیحہ نے اپنی داستان بربادی سنائی۔ نگران کار نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ سراج کے کرتوت کو بے نقاب کریں گے قانونی چارہ جوئی میں اس کی پوری مدد کریں گے۔ صبیحہ نے کہا کہ یہ سزا اس کے لئے کافی نہیں ہوگی وہ کوئی اور راستہ نکالے گی۔اسی دن سراج کی کمپنی سے سرخ شعلے اٹھ رہے تھے کمپنی جل رہی تھی اور دوسرے دن کے اخبار میں سرورق پر جلی حرفوں میں خبر چھپی تھی" سیٹھ سراج الدین پاگل خانہ میں"۔

ادھورے خواب

صبح تیار ہو کر وہ اپنی خالہ کے ساتھ دواخانہ گیا جہاں اس کی ماں موت و حیات کی کشمکش میں بتلا تھی اس کا چہرہ اس کتاب جیسا لگ رہا تھا جس میں مقدس عبارت لکھی ہو وہ اولاد آج ایک ماں کی زندگی سے کھیل رہی تھی جسے تخلیق کی کٹھن منزل سے گزر کر جنم دیا تھا خون جگر پلا کر ــــــ

زندگی تجھکو بھلایا ہے بہت دن ہم نے
وقت خوابوں میں گنوایا ہے بہت دن ہم نے
تم بھی اس دل کو دکھاؤ تو کوئی بات نہیں
اپنا دل آپ دکھایا ہے بہت دن ہم نے

جانثار اختر

سرد رات آہستہ آہستہ دبے پاؤں گزر رہی تھی ۔ آخر رات کے زرد پژمردہ چاند کی اداس دھندلی چاندنی ماحول کو پراسرار بنا رہی تھی ۔ ہوا کی نمی بتا رہی تھی کہ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے ۔ منظور ماں کو دواخانہ میں شریک کر کے گھر لوٹا تھا نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی ۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں ۔ آسمان کی بلندیوں سے غبار سا فضاء میں چھا رہا تھا اور زمین کی پستیوں سے گرد سی اڑ رہی تھی چاروں طرف دھندلاہٹیں بکھری ہوئی تھیں ۔ وہ اپنی ماں کے کمرے میں آیا ایک ایک چیز کو آنکھوں سے لگا کر چومنے اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔ رات کا سناٹا بھی اس کے ساتھ سسک اٹھا ۔ وہ ماں کی تصویر سے مخاطب تھا "ماں تم جلدی اچھی ہو کر آجاؤ اپنی بات کو منوانے کے لیے مجھے اس قدر نہ ستاؤ ماں ! تم اتنی پتھر دل تو نہ تھیں پھر آج .... آج یہ میرے ڈھیر سارے آنسوؤں پر تمہیں رحم کیوں نہیں آتا ۔ میری پیاری امی ! آجاؤ ! دیکھو ! دیکھو میرا رواں رواں تمہیں آواز دے رہا ہے آجاؤ ماں ! "

اس کی سسکیاں ہچکیوں میں تبدیل ہو گئیں ۔ وہ ماں کے پلنگ کی پٹی پر سر رکھے بیٹھ گیا ۔

باپ کے انتقال کے بعد منظور اور فیروز کی تعلیم و تربیت کے لیے ماں نے بڑی محنت کی تھی ۔ وہ لوگ اعلیٰ خاندان سے تھے لیکن امیر نہیں تھے ۔ شاہ سے گدا تک ہر ایک کی زندگی گزر ہی جاتی ہے ۔ وہ بھی کروڑوں متوسط لوگوں کی طرح زندگی گزار رہے تھے ۔ منظور جب === عربستان === چلا گیا تو ماں نے سکون کا سانس لیا تھا ۔ جلد ہی ایک اچھے خاندان کی اچھی لڑکی سے اس کا رسم کر دیا ۔ تفصیلی خط کے ساتھ اس کی تصویر بھی بھیج دی اور مطمئن ہو گئی ۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ خوبصورت امیدوں پر گزرنے والی خوشیوں بھری زندگی کے پیچھے بدنصیبی گھات لگائے بیٹھی تھی

منظور دو سال بعد جب واپس وطن لوٹا تو ہاجرہ بھی اس کے ساتھ تھی ۔ وہ اس کے بچپن کے دوست اظہر کی نسبتی بہن تھی دو چار بار اظہر کے ساتھ اس کے سسرال جانے کا اتفاق ہوا اور وہیں ہاجرہ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی ۔ ہاجرہ کا باپ شہر کا مشہور درزی تھا ۔ جس کی ایک لڑکی سے اظہر کی لو میریج ہوئی تھی ۔ وہ دونوں

عرب ملک میں ملازمت کر رہے تھے۔ اظہر نے اپنے خسر، خوش دامن، برادر نسبتی اور نسبتی بہن کو وہیں بلوالیا تھا۔ وہ منظور کو بھی بلوانے کی کوشش کر رہا تھا اس سلسلے میں ہاجرہ کی خاص دلچسپی اور کوشش شامل تھی۔ وہاں جانے کے بعد منظور بیمار ہو گیا ہاجرہ نے اس کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیئے اور یہیں سے دوریاں نزدیکیوں میں بدلنے لگیں۔

منظور جب وطن واپس لوٹا تب اس نے ایک دن اپنی ماں کو بہت اچھے موڈ میں پایا اور موقع کو غنیمت جانکر اس نے اپنی ماں سے ہاجرہ کا تذکرہ کیا۔ اور اس نے بتایا کہ وہ ہاجرہ سے شادی کرنا چاہتا ہے جسے ماں نے سختی کے ساتھ منع کیا اور ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ہوش کے ناخن لو منظور! جذبات کی رو میں بہنا برا ہوتا ہے۔ ایک درزی کی لڑکی سے شادی کروگے کیا خاندان کے نام پر سیاہ دھبہ لگوانا چاہتے ہو؟ میں یہ نہیں کہتی کہ غریب لوگ یا چھوٹے خاندان کے لوگ برے ہوتے ہیں۔ دراصل میں نے اس بات کو محسوس کیا ہے کہ ہمارے اور ان کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج کی فلموں اور ٹی وی نے نوجوان نسل کو راہ راست سے ہٹا دیا ہے۔ تم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اسی سیلاب میں بہہ نکلے۔ مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی"۔

ماں کے لہجے میں مایوسی پنہاں تھی۔

"ماں! ماں آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں ماں!" منظور نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

منظور! تم بھول رہے ہو کہ میں نے اپنی ہر خوشی اور خواہش کی قربانی دے کر تم لوگوں نے اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں تمہیں اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے ایک معمولی لڑکی کے لیے اپنے خاندانی وقار کو مجروح کرنا کونسی عقلمندی کی بات ہے۔ ایک بات ذہن نشین کر لو منظور! ٹاٹ کا پیوند کبھی مخمل میں زیبا نہیں دیتا۔ آج کے دور میں محبت ایک ایسا جذبہ بن کر رہ گیا ہے جس کی مثال جھاگ کی مانند ہے جو ابھرتا، پھولتا اور پھر بیٹھ جاتا ہے۔ بے جوڑ شادیاں جلد ہی ٹوٹ جاتی ہیں اور سوائے

پچھتاوے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ کیا تم نے اس لڑکی کے بارے میں کبھی سوچا ہے جس نے تمہیں اپنا نیم خدا مان کر اپنی قسمت کی ڈور تمہارے ساتھ باندھ رکھی ہے؟"

منظور کی ماں غصے سے لرز رہی تھی۔ منظور نے کہا۔

"میں نے ہاجرہ سے وعدہ کیا ہے۔ مجھے اپنی زبان کا پاس و لحاظ رکھنا ہے۔"

اس کے لہجے سے بغاوت کی بو آرہی تھی۔ اس کی ماں نے گرجدار آواز میں کہا۔

"تمہیں اپنی زبان کا پاس و لحاظ رکھنا ہے اور مجھے اپنی آن کا لحاظ رکھنا ہے۔ تم یہ نہ بھولو کہ مجھے اپنا خاندانی وقار تمہارے وعدے سے زیادہ عزیز ہے۔"

"میں مجبور ہوں امی جان! میں ہاجرہ کے معاملے میں اتنا آگے بڑھ چکا ہوں کہ پیچھے ہٹنا میرے لیے محال ہے۔ میری عزت اور انا کا سوال ہے۔ خاندان اور خاندانی وقار سب فرسودہ باتیں ہیں۔ مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

"منظور! تم نادان ہو........ ناسمجھ ہو۔ انجانے میں غلطی کر رہے ہو میں نہیں چاہتی کہ کل کے دن تم پچھتاوے کی آگ میں جلنے لگو۔"

منظور کو ماں کی برہمی کی پرواہ نہیں تھی وہ اپنی ضد پر قائم تھا اس نے کہا "میں اپنا اچھا برا سمجھ سکتا ہوں میرا معاملہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں زندگی مجھے گزارنی ہے۔"

جوان بیٹے کی ضد ماں کے حواسوں پر بجلی بن کر گری وہ جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی اور چند لمحوں بعد وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ منظور نے بمشکل اسے ہوش میں لایا اور دواخانہ لے گیا جہاں اسے شریک کر لیا گیا۔ چھوٹا بھائی فیروز ماں کے پاس تھا وہ ماں کے ساتھ گزرنے والے حادثے سے بے خبر تھا۔ حیران تھا۔ دواخانہ سے واپسی پر منظور ہاجرہ کے گھر گیا اسے حقیقت حال سے آگاہ کیا اور کہا کہ ایک نرس کے طور پر وہ دواخانہ میں ماں کی خدمت کرے۔

ہاجرہ نے کہا "منظور مجھے صرف تم سے کام ہے تمہارے خاندان کے لوگوں سے مجھے کیا لینا دینا، تمہاری ماں مجھ سے ناراض ہیں تو میری خدمت سے کیا خوش ہونگی۔ میرا ان کے سامنے بھی جانا مناسب نہیں۔"

"ہاجرہ تم امی کو نہیں جانتیں وہ سنگدل یا ضدی نہیں ہیں۔ تمہاری خدمت اور انکساری سے خوش ہو سکتی ہیں تم میرے ساتھ چلو۔"

"نہیں منظور میں ایسا نہیں کر سکتی ۔ مجھے مجبور نہ کرو۔"

"ٹھیک ہے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا لیکن یاد رکھنا تمہاری اس حرکت سے مجھے بہت تکلیف ہوئی ہے۔"

وہ تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ہاجرہ نے اسے بے حد مایوس کیا۔ وہ دل برداشتہ اپنے گھر گیا ماں کے پلنگ کی پٹی پر سر رکھے آنسو بہاتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح تیار ہو کر اپنی خالہ کے ساتھ دواخانہ گیا جہاں اس کی ماں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس کا سفید چہرہ اس کتاب جیسا لگ رہا تھا جس میں مقدس عبارت لکھی ہو۔ وہ اولاد آج ایک ماں کی زندگی سے کھیل رہی تھی جسے تخلیق کی کٹھن منزل سے گزر کر جنم دیا تھا۔ خون جگر پلا کر جوان کیا تھا۔ جس کی راہ کے کانٹوں کو پلکوں سے چنا تھا اور بیماری میں رات رات بھر جاگ کر صحت و سلامتی کی دعائیں مانگی تھیں اسے نیند کا انجکشن دیا گیا تھا وہ سو رہی تھی۔ قریبی رشتے دار وہاں جمع تھے منظور سر جھکائے یوں حیران پریشان کھڑا تھا جیسے ابھی پھانسی کی سزا سنائی جانے والی ہو۔ اس کی نظر اچانک ایک نازک اندام سی دوشیزہ پر پڑی کھلتا ہوا رنگ پر کشش چہرہ ہونٹوں پر صحت مند مسکراہٹ لیکن آنکھوں میں گہری اداسی سفید کپڑوں میں ملبوس سیاہ شال اوڑھے وہ ان کی طرف آرہی تھی۔ منظور غور سے دیکھ رہا تھا۔ چہرہ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا وہ قریب آئی باری باری سب کو مؤدبانہ سلام کیا اور بے حد نرم دھیمی آواز میں گویا ہوئی وہ خالہ سے مخاطب تھی۔

"میں آپ کے گھر گئی تھی معلوم ہوا کہ آپ لوگ دواخانہ گئے ہیں اس لیے میں یہاں چلی آئی۔ آنٹی کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"قدرے بہتر ہے۔" خالہ نے کھوئی کھوئی سی آواز میں جواب دیا۔ لڑکی نے اپنے پرس سے ایک لفافہ نکالا اور خالہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ کچھ توقف کے بعد چلی گئی۔ سب کی نظریں اسے تکتی رہ گئیں۔ خط منظور کی والدہ کے نام تھا لیکن خالہ نے بعجلت اسے کھولا جس میں لکھا تھا۔

محترمہ آنٹی صاحبہ!

تسلیم و قدمبوسی۔ میں نے بہت غور و خوض کے بعد یہ خط لکھا ہے

کیونکہ چند دن قبل میرے نام کسی ہاجرہ صاحبہ کا خط آیا تھا جس میں انہوں نے مجھے اپنی روداد محبت لکھی اور مجھے اپنے راستے سے ہٹ جانے کی تاکید کی ہے اسے اتفاق ہی جانیئے کہ گھر میں کوئی نہیں تھا اور خط مجھے ملا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کے نام ایک خط لکھا جاچکا ہے اور آپ کے جواب کا انتظار ہے۔ آنٹی صاحبہ! آپ پریشان ہوئی ہونگی میری ادباً گزارش ہے کہ آپ اپنے بیٹے کے معاملے میں مناسب قدم اٹھائیں میں اپنی طرف سے انکار کر دوں گی مجھے یقین ہے کہ امی اور ابو میری مرضی کے خلاف میری شادی نہیں کریں گے۔ آپ یقین رکھیں ہماری طرف سے آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ پتہ نہیں میرا یہ فیصلہ صحیح ہے یا غلط؟ بہرحال! آپ مجھے معاف کر دیں"۔

خدا حافظ

آپ کی رعنا

دواخانہ کی اداس اور بوجھل سی فضا، مریضوں کے کراہنے کی آواز سے کچھ اور اداس ہو رہی تھی۔

۷۹

خواب یا حقیقت

نو ماہ بعد تقدیر نے اس کے منہ پر ایک اور طمانچہ مارا اپنے ہی وجود کے ایک حصہ کو باہوں میں سمیٹ لینے کے شوق کی قندیلیں اس وقت بجھ گئی جب دیکھا کہ اس نے ایک سیاہ فام لڑکی کو جنم دیا ہے اسے محسوس ہوا کہ اس کے پہلو میں گوشت کا لوتھڑا نہیں بلکہ آگ کا گولہ رکھ دیا گیا ہو۔ اس کا رواں رواں انگارہ بن گیا۔

اپنے وطن کی خوشبو اسے بے قرار کئے دے رہی تھی ۔ وہاں کے سبزہ زار، ٹھنڈی ٹھنڈی گنگناتی ہوائیں، اچھلتی کودتی ندیاں، رنگ برنگے پرندے ۔ اپنا گھر اور اپنے لوگ ۔ وطن کا تصور بھی کس قدر کیف اگیں ہوتا ہے ۔ وہ چھ سال بعد وطن لوٹ رہی تھی ۔ اگریمنٹ تین سال کا تھا لیکن اپنی ماں اور بیٹی کی رضامندی سے مزید تین سال کام کرنا منظور کر لیا تھا ۔ زرین دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی سوچوں کے سمندر میں غرق تھی ۔ دیار غیر میں اس کی آخری رات تھی ۔ نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا ۔ پچھلے چار دن اس نے شاپنگ میں گزارے تھے ۔ اس کی ایک ہی تو بیٹی تھی ملیحہ جس کے لئے ہزاروں کی شاپنگ کر کے بھی وہ مطمئن نہیں تھی ۔ انٹر پاس کرنے کے بعد زرین نے اس کے ہاتھ پیلے کر دینے کا ارادہ کیا تھا ۔ لیکن اس زمانے میں لڑکیوں کی شادی کر دینا کوئی آسان کام نہیں تھا اور وہ بھی ایسی لڑکی جسے دو بار لڑکے والوں نے دیکھا تو ناگوار سی صورت بنائے ہوں اٹھ گئے جیسے ان کے منہ میں زبردستی کڑوی گولی رکھدی گئی ہو ۔ جلدی سے جلدی گھر سے باہر نکل جانے کی کوشش کرتے کہ یہ بلا کہیں لپٹ نہ جائے ۔ ماں نے بیٹی کو یہ کہکر تسلی دی تھی کہ لڑکے والوں نے اسے پسند تو کیا لیکن دریافت کرنے پر وہ لوگ ان کے اپنے معیار پر پورے نہیں اترے لہذا اب وہ خود اس کے لئے چاند سا دولہا ڈھونڈ لائے گی ۔ زرین اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی کالی کلوٹی بیٹی کے لئے چاند سا دولہا لا دینا ایسا تھا جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ ایک ہی پل میں آسمان کے چاند کو ہتھیلی پر رکھ دے گا ۔ زرین خود بے حد حسین اور ذہین تھی لیکن انتہائی غریب گھر میں پیدا ہوئی تھی اس کی ماں نے اسے اعلیٰ تعلیم دلانے کا ارادہ کیا تھا ۔ لیکن حالات نے اجازت نہیں دی پھر بھی اس نے ایک سرکاری اسکول سے میٹرک کر ہی لیا ۔ قرآن شریف کے چار دور کر لئے اور محلے کے بچوں کو جمع کر کے دینی مدرسہ گھر پر چلانے لگی ۔ جب ماں نے اس کی شادی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے تو اس کے تصورات میں کہانیوں کا وہ آن دیکھا شہزادہ آن بسا جو سفید گھوڑے پر سوار پریوں کے دیس سے آکر اسے بیاہ کر لے جانے والا تھا ۔ لیکن ایک معمولی کلرک کی بیٹی کیسے کسی شہزادے کو پسند آتی وہاں حسن صورت و سیرت تو تھا لیکن حسن دولت جو نہیں تھی ۔ مجبوراً اس کے باپ نے اپنے ہی دفتر کے ایک

کلرک کے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ دیدیا۔ زرین کے خوابوں کے شیش محل آن واحد میں زمین بوس ہوگئے کیونکہ اس کا دولہا کسی جادونگری سے آیا ہوا کوئی شہزادہ نہیں تھا بلکہ ایک سیاہ فام کلرک تھا جس کے چہرے پر صرف دو بڑی بڑی سفید آنکھیں اور سفید لیکن بدنما دانت نظر آتے تھے۔ غریب کی بیٹی نے مقدر کے لکھے پر صبر کر لیا اور خاموشی سے اپنے آپ کو وقت کے دھارے پر ڈال دیا۔ زندگی کٹ رہی تھی جیسے کوئی اپاہج پتھریلے اونچے نیچے راستوں پر منزل کی تلاش میں بھٹک رہا ہو۔ دو سال بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ ماں بننے والی ہے ایک بار وہ پھر تصورات کی دنیا میں کھو گئی اسے ہر وقت ایک ننھا منا سا شہزادہ ادھر ادھر دوڑتا نظر آنے لگا۔ اور نو ماہ بعد تقدیر نے اس کے منہ پر ایک اور طمانچہ مارا۔ اپنے ہی وجود کے ایک حصے کو باہوں میں سمیٹ لینے کے شوق کی قندیلیں اس وقت بجھ گئیں جب دیکھا کہ اس نے ایک سیاہ فام لڑکی کو جنم دیا ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے پہلو میں گوشت کا لوتھڑا نہیں بلکہ آگ کا گولہ رکھ دیا گیا ہو۔ اس کا رواں رواں انگارہ بن گیا۔ اس کی ذات، خود اس کی نظر میں ایک حقیر شئے بن گئی۔ طرفہ تماشہ یہ کہ وہ سیاہ فام شخص جو اس بچی کو عالم وجود میں لانے کا محرک بنا تھا۔ خود اپنی پرچھائیں کو دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا جیسے صرف جنم دینے والی ہی قصوروار ہو اور وہ اسے سزا دینا چاہتا ہو۔ لیکن ممتا کے دھارے بہہ نکلے ایک ماں نے اپنی اولاد کو کلیجے میں چھپا لیا اور زندگی کے ساتھ چل پڑی چند دن بعد معلوم ہوا کہ روٹھ کر جانے والا ایک حادثے کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لئے ان لوگوں سے روٹھ گیا ہے۔

زرین نے کڑی سے کڑی محنت کے لئے کمر کس لی۔ وہ ملیحہ کو اعلیٰ تعلیم دلا کر بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ ایسی شادی جسے لوگ برسوں یاد رکھ سکیں۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے سیاہ بھوت کے آگے یہ سب اسے ناممکن نظر آیا لہذا اس نے سعودی کا رخ کیا اور چھ سال تک ایک سرکاری دواخانے میں نرس کا کام کرتی رہی۔ ہزاروں مریضوں کی دعائیں لیتی رہی۔ تمام ڈاکٹرس اس کے کام سے خوش اور مطمئن تھے اور اس کی واپسی کا سن کر سبھی متاثر تھے۔ ایک ہندوستانی ڈاکٹر شاکر نے جو زرین کی شرافت اور محنت کی دل سے قدر کرتے تھے اسے بے حساب

تحائف سے لاد دیا تھا اور ملیحہ کے لیے ہیرے کی ایک خوبصورت انگوٹھی اس کی کامیابی پر دینے کے لیے بطور خاص دی تھی۔ اس دوران زرین کو بارہا خیال آیا کہ کاش وہ اپنی بیٹی کو ڈاکٹری پڑھا سکتی۔ چھ سال بعد وہ اپنی نور نظر کو دیکھے گی اب تو کافی سیانی ہو گئی ہے۔ خطوں میں کیسی فلسفیانہ باتیں لکھتی رہی ہے۔ ایک خط میں لکھا تھا" ماں تمہاری ہمت اور محنت میرے لیے نشان راہ بن چکی ہیں میں نے بھی جینا سیکھ لیا ہے تم میرا جہیز جوڑنے کے لیے وطن سے ہزاروں میل دور گئی ہو میں نے بھی اس جہیز میں اضافہ کے لیے ایک ڈگری لے رکھی ہے زرین نے اپنی ماں کو لکھا تھا کہ وہ ملیحہ کی شادی کے لیے ایک اشتہار دیدے اور موزوں امیدواروں کو اس کے آنے کی تاریخ سے ایک ہفتہ بعد بلوائیں تاکہ وہ خود اپنی بیٹی کے لیے دولہا کا انتخاب کر سکے۔ اس نے سوٹ کے قیمتی کپڑے بھی خریدے تھے۔ اس کے اندر خوشی کی عجیب سی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ خوشیوں کی منزل اور اس کے بیچ ،چند گھنٹوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اور جب اس کے پیلین نے سعودی کی تپتی سرزمین کو چھوڑا زرین نے بھی وہاں کی صعوبتوں اور سختیوں کے خیال کو تک وہیں چھوڑ دیا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اپنوں سے ملنے کی خوشی اور وطن کی خوشبوں کا نشہ سرشار کئے دے رہا تھا۔ بڑی مشکل سے آخری چند گھنٹے گزرے اور وہ اپنی سرزمین پر کھڑی ایرپورٹ کی بھیڑ میں اپنی ماں اور ملیحہ کو تلاش کر رہی تھی۔ پھر اس نے دیکھا کہ محبت و نور کا دریا اس کی طرف امڈا چلا آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد یہ قافلہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔ ایک ہفتہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ اور وہ دن بھی آ گیا جس دن ملیحہ کے لیے لڑکے کا انتخاب کرنا تھا۔ اس دن ملیحہ نے بتایا کہ اپنے خط میں جس ڈگری کا ذکر کیا تھا وہ آج اسے بتانا چاہتی ہے۔ اور اس نے ایک تصویر جس میں وہ اپنی ڈگری ہاتھ میں لیے کھڑی ہے ماں کے ہاتھ میں دے دی اور دوسرے ہاتھ میں ڈگری تھمادی اور کچھ دور ہٹ کر فرشی سلام کرنے لگی۔ زرین کبھی ڈگری کو اور کبھی ملیحہ کو دیکھ رہی تھی مارے خوشی کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اس نے ڈگری کو غور سے دیکھا تو آنکھوں پر یقین نہ کر سکی۔ وہ MBBS کی ڈگری تھی۔ زرین کی خوشی نکتۂ عروج کو چھو رہی تھی۔ اس نے ملیحہ کو بھینچ لیا اور بے تحاشہ چومنے لگی۔ آنکھوں سے خوشی کے آنسو برس رہے تھے جن پر اس کا قابو نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے

نماز شکرانہ ادا کی اور اپنی ماں کے ساتھ انتخاب کے لئے آنے والے لڑکوں کا انتظار کرنے لگی۔ اس کی ماں نے اخبار کا تراشا اسے بتایا لکھا تھا " ایک جاذب نظر سانولے رنگ کی صاحب جائیدار MBBS لڑکی کے لئے ڈاکٹر سے رشتہ مطلوب ہے۔ خوبصورت ڈاکٹر کو ترجیح دی جائیگی " اشتہار پر صرف تین ڈاکٹروں کے خطوط آئے تھے جنھیں آج شام ۴ بجے کے بعد آنے کے لئے لکھا گیا تھا۔ ایک ایک گھنٹے کے فرق سے تینوں آئے۔ انھوں نے ملیحہ کو دیکھا اور رسمی سی گفتگو کے بعد چلے گئے۔ ان تینوں میں دو بالکل نامناسب تھے کیونکہ وہ زیادہ عمر والے تھے۔ ایک کم عمر اور خوبرو تھا۔ ملیحہ کو دیکھنے کے بعد اس نے کوئی بات نہیں کی۔ چائے بھی زبردستی پی اور اٹھتے ہوئے کہا کہ وہ چند دن بعد اپنا جواب لیٹر کے ذریعہ بھیج دے گا۔ ایک ہفتہ بعد اس نے معذرت چاہتے ہوئے لکھا تھا کہ اسے یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔ زرین بہت پریشان ہوئی۔ حالات کی ستم ظریفی کے آگے وہ مایوسی کا شکار ہو رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کسی سنگین موڑ پر آکر ٹھہر گئی ہو۔ کیا کمی تھی اس کی بیٹی میں ؟ MBBS کی ڈگری کے ساتھ وہ ایک خوبصورت فلیٹ کی مالک بھی تھی۔ دلکش قد و خال میں لمبے بال چار چاند لگا رہے تھے۔ محض رنگ کی کمی کے باعث کیا اسے دلہن بننا نصیب نہ ہوگا ؟ اسے اپنی ساری محنت رائیگاں جاتی معلوم ہوئی۔ وہ اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہی تھی کہ اچانک کال بیل کی سریلی ترنگ نے اسے چونکا دیا۔ چند منٹ بعد نوکر نے ایک وزیٹنگ کارڈ لاکر دیا جس پر ڈاکٹر شاکر لکھا تھا وہی سعودی کا خوبرو بااخلاق ڈاکٹر جو زرین کی محنت اور شرافت کے گن گاتے نہ تھکتا تھا۔ وہ حیران سی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

ڈاکٹر شاکر ! آپ ! یہاں ؟ کیسے آنا ہوا ؟

سعودی سے کب آئے ؟

ڈاکٹر نے قدرے جھک کر کہا " جی تین دن ہوئے "

" تشریف رکھئے " زرین نے کہا " وہاں آپ نے کبھی ذکر نہیں کیا کہ آپ بھی ہندوستان آرہے ہیں " !

" جی ہاں میرا آنا اچانک ہوا۔ دراصل میری بہن کا رشتہ طے ہو گیا ہے اور

جلدی ہی شادی ہونے والی ہے میں آپکو دعوت نامہ دینے کے لئے آیا ہوں"

"شکریہ ڈاکٹر آپ نے مجھے یاد رکھا اور تکلیف اٹھائی ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں اندر سے پر تکلف چائے آگئی۔ چائے کے بعد ڈاکٹر شاکر نے کہا

"میں بغیر تمہید کے آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں اگر اجازت ہو"؟

"ضرور کہیے! میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟

"آپ مجھے اگر اپنے قابل سمجھیں تو میں آپ کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں"

زرین کو جیسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا بمشکل اس کے منہ سے کچھ الفاظ نکلے "شادی؟ میری لڑکی سے؟

آپ کرینگے ڈاکٹر؟

"اگر گستاخی ہوئی ہو تو معافی چاہتا ہوں"

"ڈاکٹر آپ مذاق کر رہے ہیں؟

میڈم میں اتنی جراءت کیسے کر سکتا ہوں!؟

"نہیں ڈاکٹر میری بیٹی آپ کے لائق نہیں ہے آپ کے لئے تو کوئی حسین اور اعلی خاندان کی لڑکی مناسب رہے گی ہم غریب لوگ ہیں میری لڑکی آپ کے قابل نہیں ہے۔ میں خود غرض نہیں ڈاکٹر"

آپ یقین کریں تو کہوں کہ میں صورت سے زیادہ سیرت کو اہمیت دیتا ہوں اور خاندانی تو وہی ہوتے ہیں جن کے خون میں شرافت رچی بسی ہو میں نے آپ کے اوصاف کو دیکھتے ہوئے بہت پہلے ارادہ کر لیا تھا کہ شادی کرونگا تو آپ کی لڑکی سے ہی کروں گا سسٹر زبیدہ سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ آپکی ایک لڑکی ہے جو ہندوستان میں اعلی تعلیم کر رہی ہے رنگ کی کمی کے باعث آپ ان کی شادی کے لئے فکر مند ہیں۔ آپ نے ہزاروں مریضوں کی تیمار داری کی ہے۔ ان کی دلجوئی اور دل سے خدمت کی ہے کیا ان کی دعائیں آپ کے ساتھ نہیں ہیں ایک تعلیم یافتہ اور نیک سیرت بیوی سے بڑھ کر اور کونسی نعمت ہو سکتی ہے اگر آپ میرا رشتہ قبول کر لیں تو یہ میری خوش نصیبی ہو گئی" زرین ہمہ تن گوش ڈاکٹر کی باتیں سن رہی تھی پھر کہا "آپ پہلے اسے دیکھ لیں پھر فیصلہ کریں" وہ ملیحہ کو آواز دے رہی تھی اور شاکر اسے روک

رہے تھے ملیحہ آگئی زرین نے اس کا تعارف کرایا" یہ ہے میری بیٹی ڈاکٹر ملیحہ ایم بی بی ایس! اب ڈاکٹر شاکر کے حیران ہونے کی باری تھی۔ڈاکٹر؟! ڈاکٹر ملیحہ! آپ نے پہلے تو نہیں بتایا تھا کہ یہ ایم بی بی ایس ہیں! اب مجھے کچھ بھی نہیں کہنا ہے بس آپ اجازت دیں کل ہی والدہ کو لے آؤں۔

چند دن بعد ایک خوبصورت دولہا سفید گھوڑے پر سوار رنگ و نور اور خوشبو کا سیلاب لئے زرین کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا چاروں طرف خوشیوں کی پریاں رقصاں تھیں۔زرین کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت!

منزل بہاروں کی

مجھے امید نہیں تھی کہ ایک دن میرے منہ پر کالک مل دو گی تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہمارے ہاں بیٹیاں اپنی جماعت ہی کے لڑکوں سے بیاہی جاتی ہیں کیا تم نہیں جانتی کہ بچپن میں ہی تمہارا رشتہ تمہارے چچازاد بھائی امجد کے ساتھ طے ہو چکا ہے"۔

میرے وجود کے اندر ٹوٹ پھوٹ سی ہو رہی تھی میرے آگے دکھوں کی اندھیری راہیں تھیں دکھ جو انسان کی کمزوریوں کے سہارے پروان چڑھتے اور عقل و خرد سے بیگانہ کر جاتے ہیں

شام کسی مجبور کی ادھوری تمنا کی طرح سسک رہی تھی۔ میں بے درد سے وقت کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی آنکھوں میں ہر وقت نمی سی رہتی میری حالت اس مسافر کی مانند تھی جسکا سب کچھ لٹ چکا ہو۔ محرومیوں اور ناکامیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا اور میرا تنہا تنہا سا وجود! فرخ درانی کے دید کی شدید خواہش نے میری آنکھوں کو بے نور سا کر دیا تھا۔ کتنے حسین تھے وہ دن رات جب فرخ سے گھنٹوں باتیں ہوتیں مسرت و شادمانی سے بھرپور لمحے تھے اور وقت ہوا کے دوش پر اڑا جاتا تھا

فرخ سے میری پہلی ملاقات عجیب حالات میں ہوئی تھی۔ اس وقت میں اپنی سہیلی روبینہ کی سالگرہ پارٹی سے واپس ہو رہی تھی رات کے دس بج چکے تھے راستے سنسان تھے ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی سرد ہوا کے جھونکے عجیب سا لطف دے رہے تھے میں نے گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی کچھ ہی دور جانے کے بعد اچانک پٹرول ختم ہو گیا رات کا وقت! راستے کی ویرانی! میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مما نے مجھے اکیلے جانے سے روکا تھا جلدی واپس ہونے کا وعدہ کر کے میں نکل پڑی تھی اور اب انکی نصیحتیں یاد آ رہی تھیں یاد نہیں اوپر والے سے کتنی بار اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی معافی مانگی کتنی منتیں کیں۔ کچھ دیر بعد مخالف سمت سے آنے والی کار کی ہیڈلائٹس نے مجھے اور خوفزدہ کر دیا پتہ نہیں آنے والے کون ہیں کتنے ہیں کیسے ہیں؟ ایک ساتھ کئی سوالوں نے دماغ پر یلغار کر دی کار قریب آئی اور میری کار سے چند فیٹ کے فاصلہ پر چرچراہٹ کے ساتھ رک گئی ایک نوجوان اترا لمبا قد، چوڑا سینہ، سانولا رنگ، بڑی بڑی جھیل سی گہری آنکھیں اور باریک تراشیدہ مونچھیں! گاڑی سے اتر کر قریب آنے تک میری نظروں نے اس کے سراپا کا مکمل جائزہ لے لیا۔ مردانہ وجاہت کا یہ دلکش پیکر میری آنکھوں کی راہ دل میں اترتا محسوس ہوا اس نے قریب آکر کہا "کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟

میں سحرزدہ سی اسے دیکھ رہی تھی۔ میری خاموشی پر اس نے کہا "کچھ تو کہیئے! رات کے گیارہ بج رہے ہیں آپ اس موسم میں اس جگہ کیا کر رہی ہیں میں آپ کی تنہائی میں مخل تو نہیں ہوا؟" "جی۔۔۔جی نہیں۔۔۔۔۔۔وہ پٹرول ختم ہو گیا ہے کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں" "میرا خیال ہے آپ کی مدد کی خاطر ہی میں نے گاڑی روکی ہے

میرے پاس پٹرول ہے آپ کی گاڑی میں ڈال دونگا اس کے سپاٹ لہجہ سے غرور سا جھلک رہا تھا۔

وہ اپنی گاڑی سے ایک پائپ اور پٹرول کا ڈبہ لے آیا۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں جانے کیوں اسے میں آنکھوں میں چھپا لینا چاہتی تھی ایک اجنبی سے یہ لگاؤ مجھے اپنے آپ پر تعجب ہوا لیکن وہ میرا محسن تھا۔ پٹرول ڈالنے کے بعد اس نے کہا "چلئے آپ گاڑی اسٹارٹ کریں آپ کو میں روڈ تک چھوڑ دوں" پرنا ٹائزڈ کئے ہوئے ایک معمول کی طرح میں نے اس کی بات پر عمل کیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی وہ اپنی کار لئے میرے پیچھے آتا رہا یہاں تک کہ میں گھر پہنچ گئی اس نے بھی گاڑی روک دی میں نے شکریہ ادا کیا "میری وجہ سے آپ کو خواہ مخواہ تکلیف ہوئی آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے بڑی مشکل سے نجات دلائی کیا میں اپنے محسن کا نام پوچھ سکتی ہوں ؟" مجھے فرخ درانی کہتے ہیں۔ آپ آئندہ کبھی رات کے وقت دور کے مقام جانے سے احتیاط کریں" وہ بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا۔ شاید مغرور اور سنجیدہ مرد ایک عورت کو زیر کر لیتے ہیں "جی میں خیال رکھونگی" میں نے آہستہ سے کہا "خدا حافظ" اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "خدا حافظ" میری نظریں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ کاش میں نے اس کا پتہ ٹھکانہ پوچھا ہوتا۔ میرے خوابوں کی دنیا میں ایک شہزادہ بستا تھا جو دیبا خانم کے ناولز کے ہیرو جیسا نڈر بہادر، رضیہ بٹ کے ہیروز جیسا تعلیم یافتہ دور اندیش اور عفت موہانی کے ہیروز جیسا سنجیدہ و باوقار تھا۔ وہ اب مجھے کہاں ملے گا ؟ کب ملے گا۔ ایک دن رفیع مما سے ٹیوٹر رکھنے کے لئے ضد کر رہا تھا کیونکہ اس کے امتحان قریب تھے۔ ممی جب راضی ہوگئیں تو اس نے بتایا کہ فرخ سر بہت اچھا پڑھاتے ہیں میں انہیں راضی کروں گا۔ فرخ! فرخ کے نام نے میرے دل میں ہلچل مچادی شاید میرا جذبہ، دل صادق تھا۔ دوسرے دن میں رفیع کے ساتھ اس کے استقبال کے لئے تیار تھی وہ اسکوٹر پر آئے تھے! "آپ ؟ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "جی ہاں حیرت ہے کہ وقت نے مجھے دوبارہ اس جگہ لایا ہے" "آیئے آیئے اندر تشریف لایئے آپ کو مکان تلاش کرنے میں دقت تو نہیں ہوئی نا ؟" جی نہیں ؟ اس کا جواب مختصر تھا۔ آج میں نے ڈرائنگ روم کو خاص طور سے سجایا تھا۔ ٹیبل کلاتھ

پردے کوشنس سبھی آسمانی رنگ کے تھے اور گلدان میں سفید گلاب بہت پیارے لگ رہے تھے۔ چائے کے ساتھ سنیکس بھی خاص تھے۔ اور چائے کے بعد پڑھائی شروع ہو گئی۔ میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے تھے ایک نیا کیف و سرور دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا باد صبا بھی مجھے گد گدا کے چلنے لگی میں بات بات پر ہنس پڑتی تھی فرخ سے ملاقاتیں ہوتی رہیں دنیا کی دلکشی میں اضافہ ہوتا گیا وقت کا بے پرواہ پرندہ تیزی سے پرواز کر رہا تھا رفیع کے امتحانات ہوئے اور وہ اچھے نشانات سے پاس ہوا میرے کہنے پر مما نے فرخ اور انکی والدہ کے لئے ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کر دیا فرخ کی والدہ اسی کی طرح باوقار اور سنجیدہ خاتون تھیں شائستگی اور اخلاق کا نمونہ تھیں میرے اندازہ کے مطابق مما ان سے مل کر خوش ہوئیں مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان خوشیوں کے پیچھے بد قسمتی میری گھات میں تھی ایک دن مما میرے کمرے کی صفائی کروا رہی تھیں انہوں نے جب ٹیبل کلاتھ اٹھایا فرخ کی ایک تصویر ان کے قدموں میں آگری۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا "شاکرہ یہ تصویر یہاں کیسے؟" مما مجھے نہیں معلوم! رفیع نے رکھ دی ہو گی" اسی وقت رفیع سے دریافت کیا اس نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اب مما میری طرف پلٹیں "شاکرہ ہم نے تمہیں اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم خود مختار ہو گئیں اور جو چاہو کر سکتی ہو"

"مما فرخ ایک اچھا آدمی ہے" میں نے ہمت کر کے کہا۔

"تو یوں کہو تم اس کے چکر میں پڑ چکی ہو مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ ایک دن میرے منہ پر کالک مل دو گی تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہمارے ہاں بیٹیاں اپنی جماعت ہی کے لڑکوں سے بیاہی جاتی ہیں کیا تم نہیں جانتیں کہ بچپن میں ہی تمہارا رشتہ تمہارے چچازاد امجد کے ساتھ طئے ہو چکا ہے" امی کا چہرہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔

"امی جماعت اور فرقہ سے کیا فرق پڑتا ہے یہ تو ہماری اپنی خود ساختہ رسمیں ہیں۔ چاہے کسی فرقہ و جماعت کا ہو ہمیں اچھے آدمی کی قدر کرنا چاہیے میں اپنے لئے فرخ کو پسند کرتی ہوں اس کی قدر کرتی ہوں" "معلوم ہوتا ہے نئی تعلیم نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ تمہارے باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد کے تم اور رفیع وارث ہو کیا جماعت کے باہر ہم اپنی دولت غیروں میں بانٹ دیں گے اور تم نے یہ کیوں کر سمجھ

دولت ہی سب کچھ نہیں خلوص اور پیار سے بھرپور زندگی بھی کسی دولت سے کم تو نہیں ہے" میری پلکیں بھیگ رہی تھیں "اب فرخ ہی میری زندگی کا حاصل ہے روبی ورنہ میں خاندان اور سماج کی ان فرسودہ رسموں اور بندھنوں سے اپنے آپ کو آزاد کرلوں گی" اور پھر روبینہ اور میں بہت دیر تک باتیں کرتی رہیں۔اس نے مجھے تسلی دی اور اسی کی بتائی ہوئی ترکیب نے میری امید بندھائی۔

دوسرے دن صبح صبح جیسے ہی میں سیڑھیوں سے گری ایک دلدوز چیخ میرے منہ سے نکل گئی مما، رفیع اور ان کے پیچھے نذیرا دوڑتے ہوئے آئے مجھے اٹھایا تو میں کھڑی نہ ہوسکی آخر مجھے پاپا کی پرانی وھیل چیئر پر بٹھاکر ورانڈے میں لے جایا گیا میری چیخوں سے مما پریشان تھیں گرم پانی کی بوتل سے سیکھا دیا مالش کی لیکن درد میں کوئی کمی نہ ہوئی پھر دواخانہ لے جایا گیا جہاں روبینہ کی بہن ڈاکٹر تھی انہوں نے معائنہ کے بعد بتایا کہ ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور ٹھیک ہونے میں وقت درکار ہوگا۔ مجھے دواخانہ میں شریک کرلیا گیا روبینہ کے ذریعہ فرخ کو کیفیت ملی وہ جیسے بلاوے کے منتظر تھے فوراً چلے آئے اسوقت مجھے اللہ میاں پر بہت پیار آرہا تھا۔یا اللہ اپنے محبوب کی قربت بھی کیا چیز ہوتی ہے ہم ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس لئے سحرزدہ سے بیٹھے تھے آج قانون، رسم و رواج شریعت و شہنائیاں سب پیچھے رہ گئے تھے۔

میں نے تمام باتوں سے فرخ کو واقف کرایا۔اور پھر وہ دن آگیا جس دن پلاسٹر اترنا تھا پلاسٹر اتارا گیا اور معلوم ہوا کہ میں زندگی بھر کے لئے لنگڑی ہوچکی ہوں مما روتی اور سینہ پیٹتی رہیں انہیں میری شادی کی فکر نڈھال کئے دے رہی تھی۔یہ بات خاندان میں پھیلی دستور دنیا کے مطابق رشتہ داروں نے ہمدردانہ الفاظ تو کہے لیکن سچی ہمدردی کوئی نہ کرسکا یہاں تک کہ امجد کا رشتہ بھی توڑ لیا گیا اب خاندان میں کوئی مجھ سے شادی کے لئے تیار نہ تھا اندھے کو دو آنکھیں مل گئی تھیں میری خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا لنگڑی جوان بیٹی مما کے لئے بوجھ بن گئی تھی۔ایک دن روبینہ فرخ کی والدہ کو ساتھ لئے آئی وہ لوگ آپس میں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر چلے گئے اس دن مما بہت خوش تھیں۔حالات میرے موافق تھے قدرت مجھ پر مہربان تھی راستے کے کانٹوں نے دامن تھام لیا اور بہاروں کی منزل میرے سامنے

لیا کہ ایک معمولی ٹیچر وہ آرام و آسائش اور خوشیوں سے بھرپور زندگی دے سکتا ہے جسکی تم عادی ہو وہ تمھاری تفریحات کا تک خرچ برداشت نہیں کر سکتا" "مما میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں کہ محبت خدا کے بعد ایک اٹل حقیقت ہے ایک لڑکی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اسے ایک چاہنے والا شوہر ملے"

"شاکرہ بے شرم نہ بنو زبان کو لگام دو میں کسی قیمت پر اپنی زبان کھونا نہ چاہتی اس کے لئے مجھے تمھاری لاش پر سے کیوں نہ گزرنا پڑے" مما کے سخت الفاظ میرے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ میرے وجود کے اندر ٹوٹ پھوٹ سی ہو رہی تھی میرے آگے دکھوں کی اندھیری راہیں تھیں دکھ جو انسان کی مجبوریوں کے سہارے پروان چڑھتے اور ہوش و خرد سے بیگانہ کر جاتے ہیں ہمارے مذہب و خاندان اور رسم و رواج کے یہ کیسے اصول ہیں جن کی پابندی نہ کی جائے تو معتوب ہو کر دھتکار دیئے جاتے ہیں۔ میرا باہر جانا آنا بند ہو گیا اور میں فرخ کی صورت دیکھنے کو ترس گئی زندگی کسی صحرا کی مانند ویران و سنسان معلوم ہو رہی تھی۔ اکثر کھڑکی میں کھڑی ہوئی گیٹ کی طرف دیکھتی رہتی کہ شاید فرخ ادھر سے گزر جائے نگاہوں کی آس و یاس دل میں چھید کر ڈالتی اور آنکھوں سے جھرنے پھوٹ پڑتے اس دن آسمان ابر آلود ہو رہا تھا۔ دل پر چھائے ہوئے اداسی کے سائے کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔ صدیوں پہلے کی جاہل عورت کا مجھے خیال آ رہا تھا جو لاپرواہ تھی لاعلم تھی وہ بھی مجبور تھی وہاں کسی بات پر احتجاج کرنا جرم تھا زبان داغ دی جاتی تھی آج عورت حق کے لئے کم از کم آواز تو اٹھا سکتی ہے۔ رونے دھونے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور آنسو اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن رونے کا انداز بدلا جا سکتا ہے میں اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر رہی تھی کہ آنے والے وقت سے کس طرح نپٹا جائے۔ میں نے دیکھا روبینہ کی گاڑی گیٹ میں داخل ہو رہی تھی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ریگستان میں پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا ہو۔ میں نے تمام واقعات اس کے گوش گزار کر دیئے۔ اس نے پوچھا "تو نے اچھی طرح سوچ لیا ہے نا کہ تو ایک ٹیچر کے ساتھ اطمینان بخش زندگی گزار سکتی ہے" "روبی میں آج اس موڑ پر کھڑی ہوں جہاں نہ کچھ سوچنے کی گنجائش ہے نہ سوچنا چاہتی ہوں روبی تمھیں میری اس بات سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ زندگی میں

تھی زندگی محو رقص تھی۔ اپنے خاندان اور جماعت کے لوگوں کے چہرے مما کے سامنے بے نقاب تھے۔ میری شادی فرخ سے ہو رہی تھی لیکن مما نے غور ہی نہیں کیا کہ شادی کے دن میرا لنگڑا پن غائب تھا اور میں دوڑ دوڑ کر ہر کام میں مما کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔

پھولوں کی چبھن

زندگی یہ تو نہیں تجھکو سنوارا ہی نہ ہو
کچھ نہ کچھ ہم نے تیرا قرض اتارا ہی نہ ہو
کبھی پلکوں پہ چمکتی ہے جو اشکوں کی لکیر
سوچتا ہوں تیرے آنچل کا کنارہ ہی نہ ہو

جانثار اختر

مجھے شہنائیوں کی گونج کسی بیوہ کی بین لگنے لگی ہے کوئی بارات نظر آتی ہے تو ہول سی ہونے لگتی ہے گھبرا کر میں جلدی سے وضو کرتی اور مصلہ بچھا کر نماز کے لئے کھڑی ہو جاتی۔ جانے کتنی رکعتیں پڑھ لیتی کہ پاؤں شل ہو جاتے۔ میں کمرے سے باہر نکل آتی آنگن میں موتیا کے پھولوں سے فضا معطر ہوتی پھول جو سیج پر بچھائے جاتے اور تربت پر بھی چڑھائے جاتے ہیں پھول جو زندگی کے کسی خوبصورت لمحے کی یادگار بن جاتے اور کبھی عمر بھر کے لئے چبھن بن جاتے ہیں۔

زندگی میں کئی بار نازک لمحے آتے ہیں کئی بار دل پر جبر کرنا پڑتا ہے۔ صبر کے کڑوے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔ سینے پر صبر کی سل رکھنا پڑتا ہے۔ کتنی عجیب ہوتی ہے یہ زندگی۔ دل و دماغ میں یہ کیسی جنگ چھڑی ہوئی تھی میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ دل کہتا کہیں بھاگ چل کسی اجنبی کا ہاتھ پکڑ کر کہہ دے کہ مجھے اپنالو میری مانگ میں ستارے بھردو۔ مجھے دلھن بنادو۔ مجھے بھی زندگی کی خوشیوں سے ہمکنار کردو۔ میری سہیلیاں اپنا اپنا گھر بسا چکی ہیں وطن سے باہر تفریحات میں مشغول ہیں اور زندگی کی خوشیاں انکے قدم چوم رہی ہیں مجھے بھی کوئی تو اپنالے! دماغ کہتا ہے صبر کر شاید تیرے دن بھی پلٹ جائیں اگر تو نے اس عمر میں کوئی غلط قدم اٹھایا تو خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ باپ کی گردن بھی جھک جائے گی۔ ماں کچھ کھا کر سو رہے گی۔ بھائی پھانسی لے لے گا چھوٹی بہنوں کی شادی کبھی نہ ہوسکے گی تو ایک بدنما داغ بن کر ان کے ماتھوں سے چپک جائے گی وہ داغ جسے دنیا کی کوئی طاقت نہ مٹاسکے گی۔ رات کی سیاہ تنہائیوں میں ایک چراغ میرے پہلو میں جل اٹھتا عمر کی پچیس بہاریں گزر چکی ہیں میں کیا کروں کوئی مجھے پسند ہی نہیں کرتا کیونکہ میرا رنگ گورا نہیں ہے صراحی دار گردن اور ہرنی جیسی آنکھیں نہیں ہیں لمبا قد اور لمبے بال نہیں ہیں۔ اور نہ ہی اتنی دولت ہے کہ لڑکے والوں کی آنکھوں میں مٹی کی طرح جھونک دیں کہ انھیں مجھ میں کوئی خامی نظر نہیں آسکے پھر مجھ پر ایک بھاری رقم خرچ کرنے کے بعد چھوٹی بہنوں کے لئے سرمایہ جوڑنے میں کتنے برس لگ جائیں گے۔

ایک دن اتفاقاً ایک سیدھی سادی محترمہ اپنی ایک کالی کلوٹی سوکھی سی بیٹی کے ساتھ مجھے دیکھنے کے لئے آئیں انہوں نے میرے سانولے سلونے ملاحت آمیز چہرے کو پسند بھی کیا لیکن اباجی نے شیخ اور سید کا مسئلہ کھڑا کر دیا کہا کہ بھئی ہم تو نجیب الطرفین ہیں اور لڑکا بھی ہمیں ہماری طرح کا چاہیئے۔ میں کس طرح انھیں سمجھاتی کہ شیخ، سید اور پٹھان کے جھگڑے میں نہ پڑیں کسی کمانے والے شریف آدمی کے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھمادیں۔ ایک کا بوجھ تو کم ہوگا۔ باقی تینوں بہنیں بھی شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہیں۔ بھائی تو ابھی انکا سہارا بننے کے قابل نہیں ہے۔ میں کچھ بھی تو نہ کہہ پائی مجھے شہنائیوں کی گونج کسی بیوہ کے بین کی مانند لگنے لگی ہے کوئی بارات نظر آتی ہے تو

ہول سی ہونے لگتی ہے گھبرا کر میں جلدی سے وضو کرتی اور مصلہ بچھا کر نماز کے لئے کھڑی ہو جاتی ۔ جانے کتنی رکعتیں پڑھ لیتی کہ پاؤں شل ہو جاتے ۔ میں کمرے سے باہر نکل آتی آنگن میں موتیا کے پھولوں سے فضا معطر ہوتی ـــــ پھول ـــــ جو سیج پر بچھائے جاتے اور تربت پر بھی چڑھائے جاتے ہیں ۔ پھول جو زندگی کے کسی خوبصورت لمحے کی یادگار بن جاتے اور کبھی عمر بھر کیلئے چبھن بھی بن جاتے ہیں ۔ چاندنی مسکرا رہی تھی جیسے میرا مذاق اڑا رہی ہو اسکی ٹھنڈی کرنیں میری رگوں میں عجیب سی دکھن بھر رہی تھیں ۔ جذبات کی لہریں کسی ساحل سے ٹکرا کر خاموش ہو جانے کے لئے بے چین تھیں لیکن اس گھپ اندھیرے میں ساحل کا دور دور تک پتہ نہ تھا ۔

ایک دن اچانک میری زندگی کی فیصلہ کن گھڑی آ گئی ابا جی کے ایک پرانے دوست آئے تھے انکی بڑی خاطر مدرات کی گئی وہ گھنٹوں بیٹھے رہے اور انکے جانے کے بعد ابا اور امی بہت دیر تک آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے پھر امی نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر وہ سب کچھ کہا جو شاید انھیں کہنا ہی چاہیے تھا ۔ انھوں نے بتایا کہ ابا کے جو دوست آئے تھے انکی بیوی کا دو ماہ قبل انتقال ہو گیا ہے اور انکے چار بچے ماں کے پیار سے محروم ہو چکے ہیں وہ ایک بیوی کی تلاش میں ابا جی کے در پر آئے ہیں تیرا ہاتھ مانگ رہے ہیں اور ابا نے ہاں کر دی ہے میں سنتی رہی امی کہتی رہیں کہ مجھے بچوں سے بھرا بسا بسایا گھر مل جائے گا اور ابا کی پریشانی بھی دور ہو جائے گی میرے اندر چھن کے ساتھ کچھ ٹوٹ گیا جسکی چبھن مجھے رگ رگ میں محسوس ہونے لگی اور ابا کے اطمینان کے لئے یہ کافی تھا کہ وہ نجیب الطرفین تھے ۔ میں اپنی پلکوں پر تھرکتے موتیوں کو سنبھالتی سب کچھ سنتی رہی میرے ضبط اور حوصلے کو آخری حد تک آزمایا جا رہا تھا آرزوؤں کے گلدان ریزہ ریزہ ہو رہے تھے ۔ میرے جسم کا رواں رواں احتجاج کر رہا تھا لیکن میرے پاس ہاں کے سوا تھا بھی کیا وہاں میری نگاہوں کی زبان پڑھنے والا کوئی نہ تھا ۔ حسین خوابوں کے اجالے ایک دھندلی شام میں بدل چکے تھے اور اس تھکی ہوئی اداس ڈھلتی شام کو میں نے سینے سے لگا لیا ۔ تیسرے دن چند مہمانوں کی موجودگی میں میرا نکاح ہو گیا نہ ڈھولک پر ملن کے گیت گائے گئے نہ بارات آئی نہ ڈولی سجی ۔ میں

خاموشی کا لبادہ اوڑھے جھر جھر جھرنے بہاتی شیشے کی کرچیوں پر چلتی پیا گھر سدھار گئی اجنبی چہرے نامانوس سا ماحول گھٹی گھٹی فضاء۔ مجھے ایک دالان میں بٹھادیا گیا تب ہی کسی نے کہا اب اس گھونگھٹ کو اٹھادو اور ان بچوں کو دیکھو جنکی دیکھ بھال تمہیں کل سے کرنی ہے۔ یااللہ کیا دلہنوں کا سواگت اسی طرح کیا جاتا ہے؟ انسان زندگی میں دو طرح کے صدموں سے دوچار ہوتا ہے ایک وہ جو اعصاب کو شل کر کے قویٰ کو مردہ کر دیتے ہیں دوسرے وہ جو انسانی جسم کے اندر برقی رو دوڑا دیتے ہیں۔ اچانک مجھے اپنے قویٰ شل اور مردہ محسوس ہونے لگے زندگی کے اس نئے سفر پر پہلے ہی قدم نے راستے کی دشواریوں کی خبر دیدی۔ کسی نے میرا گھونگھٹ الٹ دیا اور کہا " دیکھ لو یہ تمہاری نئی امی ہیں اور یہ ہیں ظہیر، نذیر، دردانہ، اور پنکی میں نے سر کو کچھ اور جھکا لیا کچھ دیر بعد مجھے ایک کمرے میں پہنچادیا۔ جہاں ایک پرانی سی تختوں والی مسہری پر میلی سی چادر بچھی تھی ایک تابدان میں کچھ پھٹی پرانی کتابیں بکھری پڑی تھیں اور ایک کھونٹی پر کچھ کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ چند منٹ بعد شاید بچوں کے والد محترم تشریف لائے اور یوں گویا ہوئے " السلام علیکم " میں نے جواب میں آہستہ سے ہاتھ اٹھادیا " سنئے ہم آپکے بے حد شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہماری پریشانی میں ہمارا ہاتھ تھاما ہے آپ کپڑے بدل کر آرام سے سو جائیں تھک گئی ہونگی دراصل آج ہماری سب سے چھوٹی لڑکی پنکی سخت بخار میں مبتلا ہے جب سے اسکی ماں کا انتقال ہوا ہے میرے ساتھ سوتی ہے آپ اجازت دیں تو اسے یہیں پر لے آؤں ؟ میرے احساسات پر ٹھنڈی ٹھنڈی سی برف گرنے لگی اور آنکھوں سے گرم گرم پانی بہہ نکلا پتہ نہیں مجھے بچی پر رحم آرہا تھا یا خود اپنے آپ پر۔ دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ کیا ایسی ہی ہوتی ہے سہاگ رات ؟ جسکی دین صرف چند ملبوسات اور چار زیورات ہیں چند ثانیوں بعد بمشکل میں نے کہا " آپکی مرضی " گلے میں پڑے پھولوں کے ہار مجھے سانپ بن کر ڈس رہے تھے یہ شادی ہے یا آزمائش ؟ اگر آزمائش ہے تو مجھے ثابت قدم رہنا چاہیے والدین نے جب کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہے تو ہر حال میں اس ہاتھ کو تھامے رہنا ہوگا کیونکہ عورت کو ایثار و اخلاص کی دیوی کہا گیا ہے وفا کی پتلی کہلاتی ہے۔

دن مہینوں اور مہینے سالوں میں ڈھل گئے میں دو بچوں کی ماں بن گئی اور

ایک دن زندگی ایک سنگین موڑ پر آکر ٹھہر گئی ۔شام کا وقت تھا ۔شام جو خود تھکی ہوئی اور مغموم سی ہوتی ہے دن ڈوبنے کے ساتھ ہی دل بھی ڈوبنے لگتا ہے ۔ موذن کی پرسوز آواز میں مغرب کی اذاں ہو رہی تھی پرندوں کے تھکے ہوئے غول اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹ رہے تھے بچوں کے والد بھی گھر آگئے سینے کے درد اور چکر سے بے حال بستر پر ایسے لیٹے کہ پھر نہ اٹھے ۔وہ دھندلی شام جسے میں نے ہنستے ہنستے گلے لگالیا تھا اب ایسی سیاہ رات میں تبدیل ہو چکی تھی جسکا سویرا نہ تھا میں بت بنی ان پھولوں کو تک رہی تھی جو انکی میت پر سجائے جا رہے تھے ۔

تہی دامن

جھیلی ہے سزا خودداری کی اور ہاتھ نہیں پھیلائے ہیں
اوروں کے لئے ہر درد سہا پھر بھی برے کہلائے ہیں
تیروں کا جنہیں فن سکھلایا خود تیر انہیں سے کھائے ہیں
جو زخم ملے ہیں اپنوں سے ان زخموں کو گنوائیں کیا
یہ زخم ہی اپنا حصہ ہیں ان زخموں پر شرمائیں کیا

یہ خوشی دیرپا نہ تھی کیونکہ فیروز نے دبے دبے الفاظ میں لکھا تھا کہ وہ بہت ہی خراب لوگوں میں پھنس گیا ہے جان توڑ محنت کر رہا ہے۔ ایک ایک مصیبت ایسی اٹھا رہا ہے کہ اکثر آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں اور یہ کہ ماموں نے اسے اپنی مدد کے لئے بلوایا تھا کیونکہ اس پر کام کا بوجھ زیادہ ہو گیا تھا..............

آج تک وہ کتابوں میں پڑھتی اور لوگوں سے سنتی رہی تھی کہ ایک دور ایسا بھی آئیگا جب نفسا نفسی کا عالم ہوگا۔ انسان کو انسان کاٹ کھائیں گے۔ خونی رشتے ایک دوسرے کو پہچاننے سے انکار کریں گے ماں باپ اولاد سے بیزار ہونگے اور اولاد ماں باپ کو بوجھ سمجھنے لگے گی۔ آج خود سارہ کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار تھی۔ دسمبر کی یخ بستہ رات تھی ایسی رات جسکی صبح نہ ہونے کا جیسے اسے یقین ہو چلا تھا۔ اپنے چھوٹے سے خوبصورت مکان کے بیڈروم میں تنہا بیٹھی ہوئی اپنے آپکو اس فاختہ کی مانند محسوس کر رہی تھی جو جلتی دوپہر میں کسی درخت کی چھاؤں کو تلاش کرتی ہوئی تھک گئی ہو اور شکاری پرندے کے خوف سے لرزہ براندام ہو۔

اتفاق سے آج اس کے دونوں بیٹوں کے خطوط آئے تھے بڑے بیٹے فاروق کو امریکہ گئے ہوئے تین سال ہو چکے تھے اور اس سال سرما میں آنے والا تھا۔ پہلے فاروق کا خط پڑھا۔ لکھا تھا کہ مصروفیات اور مجبوریوں کی بناء پر وہ اس سال آنے سے قاصر ہے۔ سارہ نے چھوٹے لڑکے فیروز کا خط پڑھا جسے سعودی گئے ہوئے ایک سال ہو چکا تھا۔ اس کا خط پڑھنے کے بعد اسے یوں لگا جیسے زندگی اپاہج و مفلوج ہو کر اس کی چوکھٹ پر سسک رہی ہو۔ زندگی جسے وہ ہمیشہ خوش رنگ پھولوں سے سجا ہوا ایک چمن سمجھتی تھی اور کانٹوں کی چبھن کو کبھی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ مصیبت و حادثات کی آندھیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ آدھی رات گزر چکی تھی لیکن نیند کا کوسوں پتہ نہیں تھا۔ سردی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جارہی تھی اور سارہ کے دماغ میں یادوں کے شعلے بھڑک رہے تھے وہ اپنے کالج کی روح رواں تھی مضمون اور افسانہ نگاری میں اس نے کئی انعام حاصل کئے بیت بازی میں اس نے اکثر کامیابی حاصل کی ڈراموں میں حصہ لینا اسے بے حد پسند تھا بی۔اے کرنے کے فوراً بعد اس کی شادی ایسے گھرانے میں کر دی گئی جہاں مشاعروں، ڈراموں، لکچر اور ادبی محفلوں کو واہیات سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اسکے گریجویٹ بیروزگار شوہر کی طبیعت بھی اس سے بالکل جدا تھی۔ سارہ نے نبھانے کی بے حد کوشش کی تھی لیکن نتیجہ وہی ہوا جو اس قسم کی بے جوڑ شادیوں کا ہوتا ہے۔ سارہ کے خوابوں کے حسین شیش محل ریزہ ریزہ ہو گئے وہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ ماں باپ کے گھر آبیٹھی دو سال بعد باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا ماں نے

تھوڑا بہت ساتھ دیا لیکن بھائیوں نے جھوٹے منہ تک نہ پوچھا۔ ایک بہن بھی تھی جو اپنی حق تلفی کے خیال سے سارہ کو نکال باہر کرنے کے منصوبے بناتی اور ماں کو الٹی سیدھی پٹی پڑھاتی رہتی۔ بڑھتے ہوئے بچوں کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر وہ ایک اسکول میں کام کرنے لگی اور ایک آفس میں پارٹ ٹائم ٹائپسٹ کی ملازمت بھی مل گئی۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ فاروق نے ایم۔ بی۔ اے کر لیا اسے امریکہ جانے کی دھن تھی۔ امیگرینٹ لڑکی سے شادی کر کے اس نے اپنی منزل مقصود پالی اور امریکہ چلا گیا۔ اسی دوران اس کے اسکول کے پرنسپال کے کسی دوست کے ہاں سعودی کے ویزے آئے ہوئے تھے انھوں نے سارہ کے لڑکے کو بھیجنا چاہا لیکن تعلیم ادھوری رہ جانے کے خیال سے اس نے اس پیشکش کو قبول نہیں کیا اور اپنے بھائی کو سعودی بھیج دیا۔ دو سال بعد جب اس نے اسی بھائی کو لکھا کہ وہ فیروز کو بلوا لے تو اس نے ماں اور بہن سے مشورہ کیا ان لوگوں نے مخالفت کی کیونکہ بہن اپنے لڑکے کو بھیجنا چاہتی تھی۔ فیروز بیروزگار تھا اور فاروق امریکہ سے دو چار ماہ میں ایک بار جو کچھ بھیجا کرتا تھا وہ بھی بند کر دیا کیونکہ بہو نے فاروق کو پابند کر دیا تھا کہ وہ اپنی ماں اور بھائی کو پیسہ نہ بھیجے کیونکہ انھیں اپنی اولاد کے لئے رقم جمع کرنی تھی۔ سارہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا ازدواجی الجھنوں کا شکار ہو اس نے صاف طور پر لکھ دیا تھا کہ اس کے پیسے کی انھیں ضرورت نہیں ہے فیروز اور وہ جو کچھ کما رہے ہیں ان کے لئے کافی ہے زندگی کٹ رہی ہے۔ اسے فیروز کی شادی کی فکر تھی اپنی زندگی میں اس کا بھی ٹھکانہ کر دینا چاہتی تھی۔ اسے آٹھ سو روپیہ ماہوار پر ایک جگہ کام مل گیا تھا لیکن اس مہنگائی کے دور میں اسے فیروز کا مستقبل تاریک نظر آیا بار بار یہ احساس ہوتا کہ اسے بھی چند سال ملک سے باہر جا کر کمانے کا موقع مل جاتا۔ اسی دوران پتہ چلا کہ وہ اپنے آفس کی ایک ہم عمر نو مسلم لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے ابھی وہ یقین اور غیر یقینی کی کشمکش میں تھی کہ بھائی کے پاس سے خوشخبری آئی کہ وہ فیروز کے لئے ویزا بھیج رہا ہے۔ فیروز چلا گیا۔ سارہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ خوشی دیرپا نہ تھی کیونکہ فیروز نے دبے دبے الفاظ میں لکھا تھا کہ وہ بہت ہی خراب لوگوں میں پھنس گیا ہے جان توڑ محنت کر رہا ہے ایک ایک مصیبت ایسی اٹھا رہا ہے کہ اکثر اسکی آنکھوں سے

آنسو رواں ہو جاتے ہیں اور یہ کہ ماموں نے اسے اپنی مدد کے لئے بلوایا ہے کیونکہ اس پر کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا ۔ سارہ ایک لمبی سرد آہ کے ساتھ سر تھام کر بیٹھ گئی سوچنے لگی کہ دکھ اور سکھ ایک دوسرے کی پرچھائیں ہیں لیکن بعض وقت اوپر والا کسی کو اتنے دکھ کیوں دیتا ہے کہ وہ موت کی دعائیں مانگنے پر مجبور ہو جائے اس نے ڈوبتے ہوئے دل کو تھاما اور فیروز کو خط لکھا کہ وہ کسی طرح بھی وہاں سے واپس آنے کی کوشش کرے ۔ سارہ کے بار بار زور دینے پر ایک سال بعد دونوں واپس آگئے کیونکہ سارہ کی ماں نے بھی لکھا تھا کہ اگر فیروز کسی طرح ماموں کو اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہو جائے تو وہ اسے پچاس ہزار بزنس کرنے کے لئے دینگی ۔ سارہ فیروز کو دوبارہ بھیجنا نہیں چاہتی تھی لیکن وہ جانے پر مصر تھا کیونکہ سارہ کی ماں اپنے وعدے سے پھر گئی تھیں ۔ فیروز ایک ماہ کی چھٹی لیکر آیا تھا جو قریب الختم تھی اس نے ماموں سے پاسپورٹ مانگا جو اتفاق سے اسی کے پاس پڑا تھا لیکن اس نے دینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فیروز وہاں جاکر مزید کچھ کمائے اس نے فیروز کو اپنے ساتھ بزنس کرنے پر مجبور کیا ماموں بھانجے میں جھگڑا ہو گیا سارہ کیا کرتی دانت بھی اپنے تھے اور ہونٹ بھی اپنے ۔ آخر کار بھائی نے بیس ہزار کا پرامیسری نوٹ لکھا کر پاسپورٹ واپس کیا یہ وہ بھائی تھے جنھوں نے اپنے بھانجوں کے سر پر دست شفقت رکھنا تو کجا کبھی اپنی بہن کو بھی نہیں پوچھا تھا ۔ رشتوں کی اس دیوار میں ہمیشہ کے لئے دراڑ پڑ گئی ۔ فیروز چلا گیا دونوں بیٹے دور ہو گئے ماں وغیرہ سے علحدگی ہو گئی اور وہ تنہا رہ گئی ۔ آج دونوں بچوں کے خطوط آئے تھے اس نے پہلے فاروق کا خط پڑھا پھر فیروز کا خط پڑھنے کے بعد وہ گم سم سی ہو گئی فیروز نے لکھا تھا کہ دو سال قبل وہ ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا اور اتفاق سے گزشتہ سال وہ بھی وہیں ملازمت کے لئے آگئی تھی اور اب دو ماہ بعد وہ واپس آرہے ہیں اور یہ کہ شادی کا پروگرام بنا کر آرہے ہیں اپنے کنج عزلت میں بیٹھی سارہ سوچ رہی تھی زندگی کے چلن بھی کتنے عجیب و غریب ہوتے ہیں کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتے ۔

چاروں طرف اندھیرا تھا دور تک روشنی کی کرن تک نظر نہیں آرہی تھی آج اسے اپنی تہی دامنی کا بری طرح احساس ہو رہا تھا ۔

خزاں رسیدہ

قسم اضطراب حیات کی
مجھے خاموشی میں قرار ہے
میرے صحن گلشن عشق میں
نہ خزاں ہے اب نہ بہار ہے
یہی دل تھا رونق انجمن
یہی دل چراغ مزار ہے

تم ۔۔۔ تم یہاں کیوں چلی آئیں ؟ کیا باہر کی دنیا سے دل بھر گیا ؟ سونے چاندی اور موٹر بنگلوں سے اکتا گئیں ؟ اب اس گھر پر کیا لینے آئی ہو جس کی دہلیز پار کرتے ہوئے تمہیں لاج نہیں آئی عورت جیسی مقدس ہستی کے نام پر تم ایک کلنک ہو۔

زمانے کے ستائے اور ٹھکرائے ہوئے، دکھوں کے سائے میں پلے ہوئے۔ ٹوٹے پھوٹے لوگ یا تو محبت اور خلوص کے بھوکے ہوتے یا پھر نفرتوں اور انتقام کے جذبوں کا لاوا دل میں چھپائے جیتے رہتے ہیں اور کچھ نہ کر سکیں تو اپنے آپ سے بدلہ لیتے ہیں۔ مصنوعی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے زندگی کے زہر کو گھونٹ گھونٹ کر پیتے ہیں۔ شاید ایسے ہی لوگوں میں سے نواز بھی ایک تھا۔ اسکی زندگی کسی المیے سے کم نہ تھی۔

نواز میرے بچپن کا دوست تھا۔ میٹرک کے زمانے سے بی۔اے تک ہمارا ساتھ تھا۔ اتنے طویل عرصے میں، میں نے کبھی اسے دل کھول کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ہمیشہ کھویا کھویا سا اداس اور خاموش رہتا، میں نے بارہا اسکی اداسی کا سبب پوچھا اسکے دکھوں کو بانٹنا چاہا لیکن اس نے ایک دن صرف اتنا کہا تھا "میرے بارے میں جان کر تم کیا کروگی تمہاری ماں کا سایہ تمہارے سر پر ہے تم خوش ہو، اپنے حال اور مستقبل سے مطمئن ہو تمہیں دیکھکر میں بھی خوش ہوتا ہوں بس!"

بی۔اے کا نتیجہ آنے سے پہلے اسے کویت میں ملازمت مل گئی اور وہ چلا گیا جاتے وقت اپنی ڈائری مجھے دے گیا۔ میں نے ایم۔اے میں داخلہ لے لیا تھا مصروفیت بڑھ گئی تھی نواز بھی وہاں جاکر بہت مصروف ہوگیا تھا دو تین مہینوں میں ایک تفصیلی خط لکھ دیا کرتا۔ جس میں وطن سے ہزاروں میل دور کڑی محنت اور تنہائی کا ذکر ہوتا۔ کفیل کی سخت گیری اور بے مروتی کا گلہ ہوتا۔ کبھی کبھی وہاں کی ملازم خواتین اور خوبصورت شہر کا بھی تذکرہ کرتا۔

ایک عرصہ بعد مجھے اسکی ڈائری پڑھنے کا موقع ملا اسکی اداسیوں کا راز مجھ پر آشکار ہو رہا تھا۔ ایک ورق پر لکھا تھا "ماں بچپن ہی سے میں تمہاری محبت اور شفقت سے بھرے ایک لمس کے لیے ترستا رہا ہوں ابو کہا کرتے ہیں جب میں دوسری کلاس میں تھا ہم سب کو چھوڑ کر تم ہمیشہ کے لئے تاروں کے دیس چلی گئیں اللہ میاں نے تمہیں اپنے پاس بلالیا۔ تب سے میں ہمیشہ تاروں بھرے آسمان کو گھورتا رہتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہیں کسی تارے میں بیٹھی تم مجھے دیکھ رہی ہوگی۔ تمہاری تصویر ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھتا ہوں، کاش تم اپنے بیٹے کی حالت دیکھ سکتیں ابو بہت

غصہ کرتے اور مجھے کوستے رہتے ہیں ۔ پھوپی جان تو اور بھی سخت ہیں ۔ کوئی بھی میرے کھانے کپڑے کا اور بیمار ہوا تو خیال رکھنے والا نہیں ہے ۔ ماں اس دنیا میں محبت اور ہمدردی نام کی کوئی چیز نہیں ہے ۔ میرا کوئی دوست بیمار ہوتا ہے تو میں اسکی مزاج پرسی کے لئے جاتا ہوں تو دیکھتا ہوں اسکی ماں کس قدر پریشان رہتی ہے ۔ تیمارداری میں رات دن ایک کر دیتی ہے ۔ صحت کی دعائیں کرتے اسکے ہونٹ نہیں سوکھتے ۔ اس ماں کو دیکھکر مجھے بری طرح اپنی محرومی کا احساس ہوتا ہے اور میرے آگے دکھوں اور اذیتوں کے لامتناہی سلسلے پھیل جاتے ہیں ۔ ماموں جان اور خالہ امی تو بھولے سے بھی ہمارے گھر نہیں آتے میں اپنا دکھ درد کسی سے نہیں کہہ سکتا کوئی میرا ہمدرد نہیں ہے زندگی کے ہر قدم پر تمہاری کمی محسوس کرتا ہوں یہ زندگی ایک ناسور بن گئی ہے ماں"

ایک اور ورق پر لکھا تھا

دیکھو ماں اب میں بی ۔ اے کے امتحان کی تیاری کر رہا ہوں ۔ مجھے یقین ہے کہ میں پاس ہو جاؤنگا لیکن سوچتا ہوں میری کامیابی پر خوش ہونے والا کون ہے ۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے پڑھائی چھوڑ دوں بلکہ یہ دنیا چھوڑ دوں ۔ میں کچھ بھی کروں تو کس کے لئے کروں کون ہے جو خوش ہوکر دعائیں دے مٹھائیاں بانٹے میرے دوست جب بھی امتحان میں پاس ہوتے ہیں انکے گھر والے جشن مناتے اور بڑی تقاریب کا اہتمام کرتے ہیں ۔ میں دل میں اداسی آنکھوں میں حیرانی لئے ان کی خوشیوں میں شامل تو ہوتا ہوں لیکن میرے اندر عجیب سی اتھل پتھل ہوتی ہے ۔ دل کرچی کرچی ہو جاتا اور درد کی لہریں میرے وجود کو گھیر لیتی ہیں ۔ میں عجیب عجیب سی حرکتیں کرنے لگتا ہوں لوگ مجھے سنکی اور دیوانہ کہتے ہیں ۔ میں ان کو کیسے سمجھاؤں کہ میرے اندر کا بچہ ماں کے پیار بھرے ایک لمس کے لئے مچل اٹھا ہے ۔ اس مقدس ہستی کو پکارنے کے لئے ہونٹ کپکپانے لگتے ہیں جسکے قدموں تلے جنت رکھی گئی ہے کاش تم نے مجھے اس وحشی دنیا میں اکیلا نہ چھوڑا ہوتا تو شاید میں بھی ایک مکمل آدمی ہوتا ۔ آج میں تمہارے بغیر ادھورا ہوں ماں بالکل ادھورا ۔"

نواز کی ڈائری کو میں آگے نہ پڑھ سکی جانے کتنی دیر سے میری آنکھوں سے گرم

گرم پانی بہہ رہا تھا۔ ایک ماں کے نہ ہونے سے اولاد کس قدر بے سہارا ہو جاتی ہے اسکا مجھے آج احساس ہو رہا تھا۔

ایک ہفتہ قبل نواز کا آخری خط ملا تھا۔ وہ ڈیڑھ ماں کی چھٹی پر انڈیا آ رہا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہاں ایک ایسی خاتون سے ملاقات ہوئی ہے جو ہو بہو اسکی ماں سے ملتی جلتی ہے۔ وہ اس سے بار بار ملنا اور ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس ملاقات کے دوسرے ہی دن وہ انڈیا جانے والی تھی۔ وہ کچھ خطوط اور کپڑے وغیرہ دینے کے بہانے اس سے دوبارہ ملا۔ اور اب اس سے ملنے کی خاطر چھٹی لے کر آ رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس سے ملنے کے لئے میں بھی بے چین تھی۔ میں نے نواز کے گھر کئی چکر لگائے لیکن اسکے ابا فیاض انکل نے ہر دفعہ یہی کہا ابھی تک کوئی نہیں آیا۔

ایک دن معلوم ہوا کہ نواز آ گیا ہے۔ میں فوراً وہاں پہنچی۔ وہ لوگ ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ میری آواز سنکر نواز بھی آ گیا۔ بجھا بجھا سا چہرہ ہونٹوں پر وہی پھیکی پھیکی مسکراہٹ۔ رسمی سی گفتگو کے بعد سے ہم لوگ خاموش تھے۔ اسی وقت گیٹ پر کسی کار کے ہارن کی آواز آئی۔ ملازم نے آکر اطلاع دی کہ ایک بیگم صاحبہ کویت سے آئی ہیں اور صاحب سے ملنا چاہتی ہیں۔ نواز دیوانہ وار باہر کی طرف لپکا اور ایک خاتون کو اپنے ساتھ لے آیا وہ کہہ رہا تھا "آپ اتنے دن تک کہاں تھیں یہاں کیوں نہیں آئیں؟ میں آپکو بہت یاد کرتا رہا ہوں آپ نے اپنا پتہ بھی مجھے نہیں دیا ورنہ میں خود آپکے پاس چلا آتا دیکھئے نا آپ سے ملنے کے لئے میں کویت سے چلا آیا ہوں یہاں تشریف رکھئے بیٹھئے نا! نواز کہہ رہا تھا اور وہ عورت فیاض انکل کی طرف حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اسکے منہ سے صرف ایک لفظ نکلا "آپ"؟ فیاض انکل جو کبھی آنے والی خاتون کو اور کبھی نواز کو دیکھ رہے تھے چند لمحوں بعد بے حد سپاٹ لیکن کرخت لہجے میں کہا "تم" "تم یہاں کیوں چلی آئیں؟ کیا باہر کی دنیا سے دل بھر گیا؟ سونے چاندی ہیرے جواہرات اور موٹر بنگلوں سے اکتا گئیں؟ اس گھر پر اب کیا لینے آئی ہو جسکی دہلیز پار کرتے ہوئے تمہیں لاج نہیں آئی! عورت جیسی مقدس ہستی کے نام پر تم ایک کلنک ہو تمہیں اس گھر کا راستہ کس نے بتایا؟ چلی جاؤ یہاں سے چلی جاؤ"۔ اب نواز پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ خاتون نے آگے بڑھ کر فیاض انکل

کے پیر پکڑ لیئے اور کہا "مجھے معاف کر دو ایک بار معاف کر دو بہت عرصہ پہلے میں نے آپ کو اور نواز کو بہت تلاش کیا لیکن کہیں پتہ نہ چل سکا۔ عیش و عشرت کی زندگی کے لالچ میں، میں صراط مستقیم سے بھٹک گئی تھی اپنے آپ کو بھلادیا تھا۔ ایک اسمگلر کے چکر میں پھنس کر میں تباہ ہو چکی ہوں۔ اس نے مجھے نشیلی دواؤں کا عادی بنا کر اسمگلنگ کے دھندے میں پھنسا دیا ہے۔ آج بڑی مشکل سے موقع نکال کر آئی ہوں دنیا کے اس طوفانی سمندر کی بے رحم لہروں پر ہچکولے کھاتی ہوئی میری زندگی کی کشتی کو اب آپ ہی بچا سکتے ہیں۔ میں تھک گئی ہوں مجھے اپنی پناہوں میں لے لو۔ جب میرا سر ننگا ہوا تب معلوم ہوا کہ شوہر کا وجود ایک مضبوط سائبان ہوتا ہے آج میں پچھتاوے کی آگ میں جل رہی ہوں مجھے سزا مل چکی ہے۔ مجھے ایک بار نواز سے ملادو! کہاں ہے وہ میں اسکے منہ سے ماں سننے کے لئے ترس گئی ہوں کہاں ہے وہ؟ کہاں ہے؟ خاتون ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی اور نواز کی آنکھوں سے سیل اشک رواں تھا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا

دائرے

میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہنے دو
میرا ماضی میری ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں
میری امیدوں کا حاصل میری کاوش کا صلہ
ایک بے نام اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں

ساحرلدھیانوی

وہ اپنے آپ لعنت بھیجتی اور والدین کو بھی برا بھلا کہتی جنہوں نے اسے جنم تو دیا لیکن پرورش صحیح ڈھنگ سے نہ کرسکے اعلی سوسائیٹی کے روح رواں تہذیب اور معاشرہ کو صاف ستھرا رکھنے کے سلسلے میں لمبی چوڑی تقریریں کرنے والے اپنے ہی گھر میں پھیلنے والی گندگی پر دھیان نہ دے سکے۔

رات کا ایک بج چکا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی جیسے وہ اب کبھی نہ آئے گی اور وہ جاگتی آنکھیں لئے تڑپ تڑپ کر مرجائے گی اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں سارا وجود لرز رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے آج دھوبی کو کپڑے دیتے وقت اس کے بیٹے شکیل کی پینٹ کے جیب سے ایک لڑکی کی تصویر ملی جسے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بالکل وہی ناک نقشہ، ہونٹوں پر وہی شرارت آمیز مسکراہٹ۔ وہ تصویر کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی پشت پر لکھا تھا "جان سے عزیز شکیل کے لیے" اور نیچے لکھا تھا "عرشی جمیل" کہیں یہ جمیل ...... جمیل۔ جس کی یاد نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کے دل کا دامن نہ چھوڑا تھا۔ ایک ایک کر کے ذہن کے سارے دریچے کھلتے جارہے تھے۔ اسے اپنا بچپن یاد آرہا تھا۔ اس کے والدین کا سوشیل اسٹیٹس کافی اونچا تھا۔ وہ شہر کے بڑے اور مشہور کلبس کے ممبر تھے ان کا زیادہ وقت گھر سے باہر گزرتا تھا۔ کئی کئی دن وہ شہر سے باہر رہتے۔ گھر میں خالہ بیگم اور نانی بی تھیں جو بات بات پر اسے ڈانٹتی اور مارا کرتی تھیں۔ وہ گھر کے ماحول سے گھبرا کر پاس پڑوس کے بچوں میں کھیل کر وقت گزارا کرتی تھی۔ ان بچوں میں ایک بچہ تھا جمیل خوبرو صحت مند اور بہادر! ایسے بچے اسے بہت اچھے لگتے تھے اس لئے وہ اسے بہت چاہتی تھی اس کی شرارتوں سے لطف اندوز ہوتی لیکن اس سے ڈرتی بھی تھی۔ جمیل ہر وقت اس پر رعب ڈالنے کی کوشش کرتا وہ بچوں کو اکساتا کہ وہ سلطانہ کو چھیڑیں ستائیں اور جب بچے ایسا کرتے تو خود ان سے لڑتا اور مار پیٹ کر انھیں بھگا دیتا اور اس وقت وہ اپنے آپ کو کسی سلطنت کا بہادر شہزادہ تصور کرتا جو کسی خوبصورت سی شہزادی کو خونخوار دیو سے بچالاتا ہے۔ اس کے اس انداز شاہانہ پر سلطانہ پھولی نہ سماتی آنکھوں میں عقیدت کے جذبات لئے وہ خوشی سے تالیاں بجاتی۔ یوں کھیلتے کودتے بچپن اپنی سرحد پار کر رہا تھا۔ جوانی کے زینے پر اپنے لڑکھڑاتے قدموں کو جماتی ہوئی وہ جمیل کو آواز دیتی کہ اسے تھام لے اس وقت اسے عجیب سے سرور کا احساس ہوتا جب چور سپاہی اور آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے وہ اسے اپنی باہنوں میں بھرلیتا۔ بچپن کی عقیدت جوانی کی محبت میں بدل رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو بے حد پیار کرتے۔ اسکول سے آتے ہی جمیل گھر میں کتابیں

پھینک کر اس کے ہاں چلا آتا۔ بڑے بزرگ ان کے جذبات و خواہشات سے بے خبر اپنے اپنے بکھیڑوں میں الجھے ہوئے! انھیں فرصت نہیں تھی کہ بچوں پر توجہ دیتے۔ بڑھتی ہوئی عمر کے لحاظ سے ان کی دیکھ بھال کرتے۔ سلطانہ میٹرک کی اور جمیل انٹر کی تیاری کر رہا تھا۔ خالہ بیگم بیاہ کر چلی گئی تھیں اور نانی بی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اب وہ گھر میں اکیلی رہتی گو کہ والدین کی مصروفیات کم ہوگئی تھیں پھر بھی انہوں نے سلطانہ کی دیکھ بھال کے لئے ایک گورنس کو مقرر کیا تھا جو عمر رسیدہ بیوہ تھی لیکن اکثر اس کے ہاتھ میں عشقیہ ناول ہوتے اور وہ اپنے کمرے میں زیادہ وقت گزارتی تھی سلطانہ بھی اسے زیادہ ڈسٹرب نہ کرتی ورنہ وہ جمیل سے کیسے ملتی جو کالج سے سیدھے وہاں دوڑا ہوا آتا اور دونوں ادراک و شعور کی بند گتھیاں کھولنے میں مصروف ہوجاتے۔ اور ایک دن اس کے ممی پپا اچانک گھر آگئے اور ۔۔۔۔۔۔ پپا نے لاتوں گھونسوں سے جمیل کی خبر لی اور گھسیٹتے ہوئے لاکر دروازہ کے باہر دھکیل دیا اسے بچانے کے لئے جب وہ آگے بڑھی تو ماں اسے کھینچتی ہوئی کمرے میں لے گئی اندر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔ ان کی آنکھیں تب کھلیں جب اس نے اپنا سب کچھ جمیل پر نچھاور کر دیا اسے اپنے دل و جان کا مالک بنا بیٹھی وہ اس کی رگ رگ میں سما چکا تھا اور تقدیر اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ والدین نے اچانک کسی جگہ اس کی شادی طے کر دی تیاریاں شروع ہوگئیں اس پر سخت پہرہ لگا دیا گیا لیکن اس کی محبت تو عشق کی حدوں کو پھلانگ رہی تھی جنون سر پر سوار تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ اگر شادی کرے گی تو صرف جمیل سے ورنہ اپنی جان دیدے گی۔ ایک رات موقع پاکر بھاری کپڑوں اور نقدی کے ساتھ جمیل کے گھر پہنچ گئی اس کی راتیں بھی جاگ جاگ کر گزر رہی تھیں ہلکے سے کھٹکے پر دروازہ کھول دیا۔ سلطانہ نے کہا کہ وہ ساری دنیا کو چھوڑ کر آگئی ہے اور وہ اسے وہاں لے چلے جہاں دنیا والے ان کے پیار پر پہرے نہ بٹھا سکیں۔ جمیل سراسیمگی کے عالم میں کھڑا سلطانہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ پا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا کہ وہ فی الوقت زیر تعلیم ہے اور والدین کا دست نگر ہے وہ آنے والے وقت کو کس طرح سنبھال سکے گا۔ لہذا وہ وہیں پر شادی کر لے جہاں اس کے والدین چاہتے ہیں۔ سلطانہ کو اپنی دنیا ویران ہوتی نظر آئی کتنا بھروسہ تھا اسے جمیل پر

اور کس قدر ٹوٹ کر چاہا تھا اسے، کبھی سوچا تک نہیں تھا کہ وہ اس طرح بیچ منجدھار میں چھوڑ دے گا جب کہ وہ اس کے لئے ماں باپ کی عزت اور اپنے مستقبل کی تک پرواہ نہ کی تھی اس کا دل ریزہ ریزہ ہو گیا محبت کا تاج ریت کے گھروندے کی طرح ڈھے گیا۔ وہ زخم خوردہ پرندے کی طرح لڑکھڑاتے قدموں سے واپس آگئی اور سجاد اس کی زندگی کے مالک بنا دیئے گئے۔ شادی کے سات ماہ بعد اس نے ایک لڑکے کو جنم دیا جو ہوبہو جمیل کی کاپی تھا۔ سجاد اسے دل وجان سے پیار کرتے تھے لیکن سلطانہ کا دل دھڑک جاتا جو جانتی تھی کہ سجاد کی اولاد نہیں ہے اس کا ضمیر اسے ہر وقت ملامت کرتا رہتا وہ اپنے آپ پر لعنت بھیجتی اور والدین کو بھی برا بھلا کہتی جنھوں نے اسے جنم تو دیا لیکن پرورش صحیح ڈھنگ سے نہ کر سکے اعلیٰ سوسائٹی کے روح رواں اپنی تہذیب اور معاشرہ کو صاف ستھرا رکھنے کے سلسلے میں لمبی چوڑی تقریریں کرنے والے اپنے ہی گھر میں پھیلنے والی گندگی پر دھیان نہ دے سکے! وہ سجاد پر اگر حقیقت ظاہر کر دیتی تو شاید اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا لیکن اس کے بعد کے بھیانک نتائج کا تصور کر کے اس کا دل دہل جاتا پھر اس نے ہمیشہ کے لئے اپنی زبان بند کر لی تھی لیکن آج وہ ہمت ہار رہی تھی۔ درد و کرب کے شدید طوفان میں وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ اسے یہ بھی احساس نہ تھا کہ وہ مسلسل دو گھنٹوں سے ٹہل رہی ہے اور رات کا ایک بج چکا تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور وضو کر کے نماز کے لئے کھڑی ہو گئی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی اور جب اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے فجر کی اذاں ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ تیار ہو کر گیراج سے گاڑی نکال رہی تھی۔ بائیس سال بعد پہلی بار وہ جمیل کے گھر جا رہی تھی۔ آنے والے طوفان کو روکنے کے لئے سوائے جمیل کے کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ماں کے دل میں بیٹے کو دولہا بنے دیکھنے کی کتنی خواہش ہوتی ہے کیسے کیسے ارمان دل میں ڈیرہ جمائے ہوتے ہیں بیٹے کے سر پر سہرا باندھ کر ایک عورت ایک ماں اپنی زندگی کی معراج پا لیتی ہے۔ لیکن یہ کیسی مجبوری تھی یہ کیسا وقت آن پڑا تھا کہ۔۔۔۔۔۔

سوچتے سوچتے وہ مسکرا پڑی ایک زہریلی مسکراہٹ! اس کے باپ نے اس کا دل توڑا تھا وہ زخم دیا تھا جو آج ناسور بن کر رس رہا تھا اس کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا

جمیل کا قصور یہ تھا کہ وہ غریب تھا اور سوسائٹی میں اس کا کوئی مقام نہیں تھا اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تقدیر نے ان سب کے ساتھ کیسا مذاق کیا تھا۔ اس پر ایک ہذیانی سی کیفیت طاری تھی ۔ چند منٹ بعد وہ جمیل کے مکان پر کھڑی ہوئی تھی خیالوں میں گم کال بیل پر ہاتھ رکھا تو ہٹانا ہی بھول گئی اور اس وقت چونکی جب ایک دھڑاکے سے دروازہ کھلا اور سامنے جمیل کھڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف نظریں دوڑاتی وہ اندر گھستی چلی گئی نہ سلام نہ دعا۔۔۔۔ جمیل نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"کیا بات ہے سلطانہ اس طرح حواس باختہ کیوں ہو کسے ڈھونڈ رہی ہو؟

"تمہاری بیٹی کہاں ہے جمیل؟

اس کا نام کیا ہے؟

"عرشی ہے! لیکن بات تو بتاؤ کیا ہوا ہے" جمیل کے لہجہ میں حیرانی تھی۔

"عرشی؟! اف جمیل یہ کیا ہوا یہ کیوں اور کیسے ہو گیا"؟

سلطانہ سر پکڑ کر ایک کرسی پر گر گئی۔

"جمیل نے اس انجانے میں وہ کام کر دیا ہے جو اسے نہ کرنا چاہیے تھا وہ میرے بیٹے شکیل سے محبت کرتی ہے جو"۔۔۔۔ جو تمہارا بھی بیٹا ہے جمیل! تقدیر نے ہم پر بڑا ستم کیا ہے وہ دونوں۔۔۔۔

کیا کہہ رہی ہو سلطانہ؟ تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا تم نے یہ بات مجھے آج تک کیوں نہیں بتائی؟

"یہ دیکھو یہ تصویر شکیل کی جیب سے آج ہی برآمد ہوئی ہے"

سلطانہ نے روتے ہوئے کہا۔" جمیل نے تصویر کو دیکھا اور سر تھام لیا"۔

بکھرے موتی

شاید آغاز ہوا پھر کسی افسانے کا
حکم آدم کو ہے جنت سے نکل جانے کا

شکیل

پیاری ممی میں نے سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے کیونکہ میں نے اپنی بہن کے انجام کو دیکھ لیا ہے کہ وہ کس طرح ایک لنگڑے کے حوالے کی جا رہی ہے کل کے دن آپ لوگ مجھے کسی اندھے کے حوالے نہ کر دیں۔ میں اعجاز سے محبت کرنے لگی ہوں اور اسی کے ساتھ جا رہی ہوں آپ لوگوں کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہمیں اعلیٰ تعلیم دلائی اعلیٰ سوسائیٹیز میں Move ہونا سکھایا لیکن ہمارے جذبات و احساسات سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں کھوئے رہے۔

صبح ہو جانے کے باوجود اندھیرا تھا۔ گھٹاؤں نے صبح کے نور کو اپنی دبیز سیاہ چادر میں ڈھانپ رکھا تھا۔ جیسے ہی ممتاز کی آنکھ کھلی اس نے ٹائم پیس پر نظر ڈالی چھ بج چکے تھے۔ اسے یاد آیا کہ وہ رات دیر تک جاگتی رہی تھی اس کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا انتہائی سرد موسم ہونے کے باوجود اسے گرمی کا احساس ہو رہا تھا اس نے کن انکھیوں سے شہناز کے بیڈ کی طرف دیکھا جہاں رات دیر گئے تک ایک طوفان بپا تھا اور اب مکمل سکوت۔ ممتاز آہستہ سے ٹھی اور سیدھے باتھ روم میں گھس گئی چند لمحوں بعد وہ جھاگ سے بھرے ہوئے ٹب کے نیم گرم پانی میں عجیب سا سرور محسوس کر رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ جھاگ کوئی جاندار شئے بن کر اس سے لپٹ جائے اور اتنا زور سے دبائے کہ وہ درد سے کراہ اٹھے جیسے ۔۔۔ جیسے رات شہناز آہیں کراہ رہی تھیں۔ آج صبح اس کے ممی ڈیڈی کلب کے ممبرس کے ساتھ گوا چلے گئے تھے اور شہناز نے سلطان کو رات کے کھانے پر روک لیا تھا وہ انکا کلاس میٹ تھا اور اکثر ان کے گھر آیا کرتا تھا۔ رات اچانک اس کی آنکھ کھل گئی اس نے دیکھا شہناز اور سلطان باتوں میں مصروف تھے۔ وہ تو چلا گیا تھا پھر اس وقت یہاں کیسے؟ اس کا دل بے تحاشہ دھڑک رہا تھا۔ ان کا چچازاد بھائی عارف بازو والے بیڈ روم میں سو رہا تھا اگر وہ جاگ گیا تو کیا ہوگا بہر حال رات گزر گئی اور اس گھر کی عزت کا دامن تار تار کر گئی اس کا دل چاہا کہ ممی اور ڈیڈی اسی طرح مصروف رہا کریں اور وہ ہر روز یہ تماشہ دیکھتی رہے خیالات کی ادھیڑ بن میں ایک گھنٹہ گزرا وہ ٹب سے باہر نکلی اور تیار ہو کر سیدھے باورچی خانہ کی طرف چل دی جہاں اعجاز توسٹ سینکنے کے بعد انڈے تل رہا تھا۔ آج اسے اعجاز پر پیار آ رہا تھا۔ پیار بھرے لہجے میں پوچھا

"رات سردی بہت تھی تجھے نیند تو اچھی آئی نا؟ اعجاز نے اس بات پر سر ہلا دیا

"تو نے ابھی تک اپنے لئے گدا بھی نہیں سلوایا دیکھ تو سردی کتنی بڑھتی جا رہی ہے"

اعجاز کو اس کے ڈیڈی کسی گاؤں سے لے آئے تھے اٹھارہ انیس سال کا سیدھا سادہ غریب لیکن تنومند اعجاز جب سے آیا تھا گھر اور باہر کے تمام کام اس کے ذمہ کر دیئے گئے تھے۔ سبھی کا سلوک اس سے اچھا تھا ایک ممتاز تھی جو کبھی اس سے سیدھے منہ بات تک نہیں کرتی تھی اس کے کپڑے کبھی گندے معلوم ہوتے تو کبھی اس کے

ہاتھ گندے معلوم ہوتے آج ممتاز کے منہ سے پھول جھڑتے دیکھ کر وہ حیرت زدہ تھا گم سم تھا۔ پین میں پڑا ہوا انڈا جلنے لگا تب ممتاز نے کہا "ارے ارے کہاں کھو گیا دیکھ تو انڈا جل رہا ہے باقی انڈے میں تل دونگی تب تک تو ناشتہ لگادے " مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور چمچہ لے لیا وہ اعجاز کو گھور رہی تھی اور اعجاز اس کے رویہ پر حیران تھا وہ احمقوں کی طرح پلکیں جھپکا رہا تھا۔ منٹوں میں اس نے ناشتہ لگادیا۔ کچھ دیر بعد دنوں بہنیں کالج چلی گئیں۔ گھر کی نگرانی کے لئے عارف تھا جو ممتاز کے چچا کا لڑکا تھا بچپن سے لنگڑا ماں باپ ریل کے حادثہ میں چل بسے تھے اور اسکے والد نے بھائی کی جائیداد پر قبضہ کر کے جعلی دستاویزات کی بنا پر عارف کو یہ باور کرادیا تھا کہ اس کے والد مقروض تھے لہذا جائیداد سے قرضہ وصول کرنے کے بعد بھی ان پر باقی رہتا ہے لیکن بھائی کے ناطے انہوں نے معاف کر دیا اور دوگنی مہربانی یہ کی کہ انکے بیٹے کو اپنے ہاں پناہ دی۔ اس پیسہ سے فراز احمد نے بزنس کیا اور خوب دولت کمائی۔ روپیہ کی ریل پیل نے حسب دستور ان کا اور ان کی بیگم کے دماغ کو سڑادیا یار لوگوں نے عیاشی کی نت نئی راہیں بتادیں بیوی اور بیٹیاں اعلی سوسائیٹی کی روح رواں بن گئیں گو بیگم فراز نے نئی راہوں پر چلنے سے انکار کیا تھا لیکن آہستہ آہستہ اپنے آپ بدل گئیں۔ اونچی محفلوں نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا بیٹیاں جوان تھیں لیکن ماں باپ کو بڑھاپا بھول گیا تھا۔ نت نئے فیشن کے کپڑے زیب تن کئے اعلی ترین سینٹ کی خوشبو اڑاتی کسی کلب میں اپنی ہم عمر یا کم عمر عورتوں کے ساتھ سگریٹ نوشی کرنا اور تاش کھیلنا ان کا دل پسند مشغلہ بن گیا تھا۔ اور فراز احمد اپنی فیملی کو اپ ٹو ڈیٹ زمانے کے رنگ میں رنگا دیکھ کر پھولے نہ سماتے گو اسے آنے کے بعد ماں کو جب پتہ چلا کہ شہناز ماں بننے والی ہے تو اسے نانی بننے کے خیال سے الجھن سی ہونے لگی اس بات کی فکر و پرواہ نہیں تھی کہ بن بیاہی بیٹی ماں بنے گی انہوں نے کہا کہ وہ اپنے ہونے والے بچے کے باپ سے شادی کرلے یا پھر کسی نرسنگ ہوم میں ابارشن کروالے۔ جب شہناز نے ماں کی تجویز سلطان کے سامنے رکھی تو اس نے کہا کہ وہ شادی تو اس سے کرے گا نہیں اور وہ کسی اور سے شادی کرنے جارہی ہو تو اسے منہ بند رکھنے کی قیمت ایک لاکھ روپے دیئے جائیں۔ جوانی کا نشہ اتر چکا تھا وہ اپنے آپ کو ایک سوکھے پتہ کی

مانند ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی جب یہ بات ماں کو بتائی تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی وہ اپنے میاں سے رائے مشورہ کے لئے دوڑ پڑیں آخر کو وہ خاندانی تھے سوسائٹی میں عزت دار کہلاتے تھے اعلیٰ سوسائٹی کے لوگ تو اپنے دامن کا ہر دھبہ دولت کے پانی سے دھوڈلتے ہیں۔ انہوں نے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ عارف کو قربانی کا بکرا بنایا جائے شہناز کی شادی اس سے کرنا طئے پایا۔ ممتاز سب کچھ سمجھتی ہوئی انجان تھی۔ شہناز اور سلطان کے کھیل کا انجام اس کے سامنے تھا لیکن جوانی کا نشہ اس کے حواس پر چھایا ہوا تھا۔ جس گھر میں مذہب سے بیگانگی ہو، کوئی بندش و پابندی نہ ہو، خیر و شر میں تمیز کرنا کوئی جانتا نہ ہو تو پھر اخلاقی قدروں کے ٹوٹنے کا کسے افسوس ہوگا۔ فراز احمد کے گھر میں اٹھا ہوا طوفان جوش پر تھا اور جوش میں ہوش کہاں رہتا ہے۔ موسم سرما کی تلاطم خیز وہ رات برق رفتاری کے ساتھ منزل کی طرف گامزن تھی اور ممتاز مسرت و شادمانی کی منزل کو پالینے کے لئے بے چین تھی۔ شہناز اور عارف اپنے اپنے کمروں میں تھے والدین حسب معمول گھر میں نہیں تھے۔ ممتاز نے اعجاز کو چائے بنا کر لانے کہا جب وہ چائے لے کر آیا تو اسے سردبا نے کہا وہ جھجک رہا تھا لیکن ممتاز نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنی پیشانی پر رکھ لیا۔

صبح وہ اپنے آپ کو بدلا ہوا پا رہی تھی اس کا انگ انگ سرور میں ڈوبا ہوا تھا۔ اعجاز کی حالت غیر ہو رہی تھی وہ کرنا کچھ چاہتا تھا اور کر کچھ رہا تھا۔ شہناز کی شادی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں لیکن ممتاز نے جو حالات پر نظر رکھے ہوئے تھی موقع پا کر سیف سے تمام زیورات اور نقدی لیکر اعجاز کے ساتھ راہ فرار اختیار کی اور جاتے جاتے ماں کے نام ایک خط چھوڑ گئی۔ لکھا تھا:

ممی ڈیر ممی!

پیاری ممی میں نے سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے کیونکہ میں نے اپنی بہن کے انجام کو دیکھ لیا ہے کہ وہ کس طرح ایک لنگڑے کے حوالے کی جا رہی ہے۔ کل کے دن آپ لوگ مجھے کسی اندھے کے حوالے نہ کر دیں میں اعجاز سے محبت کرنے لگی ہوں اور اسی کے ساتھ جا رہی ہوں۔ آپ لوگوں کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہمیں

اعلیٰ تعلیم دلائی اعلیٰ سوسائٹیز میں Move ہونا سکھایا لیکن ہمارے
جذبات و احساسات سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں کھوئے رہے ۔آپ
کی غیر موجودگی میں ڈیڈی کو اور ڈیڈی کی غیر موجودگی میں آپ کو
اپنے اپنے دوستوں میں مگن دیکھ کر ہمیں اپنی تنہائیاں بار گزرنے
لگیں ۔آپ نے راستہ دکھایا ہم نے منزل پائی شہناز آپی کے لئے آپ
دوسرے زیورات بنوالیں دولت کی کمی تو نہیں ہے چچا کی جائیداد
سے لی ہوئی کافی دولت آپ کے پاس موجود ہے ۔

کرن

عالم نہ پوچھیے جو ہمارا ہے آج کل
کشتی بھنور میں دور کنارا ہے آج کل
تیرے ہی غم کا دل کو سہارا ہے آج کل
بے کیف زندگی بھی گوارا ہے آج کل

(شکیل)

"تمہیں میری زندگی کے ساتھ کھیل کر کیا ملا؟" میں مجبور تھی پریم اس قدر مجبور کہ تمہیں کچھ نہ بتا سکی قسمت نے تو میرے ساتھ مذاق کیا تھا میں اتنی گر گئی تھی کہ تم سے آنکھ ملانے کے قابل نہیں تھی پریم میں آج سب کچھ بتا دوں گی اپنے دل کی آگ بجھا لوں گی۔ پریم یہ دنیا والے بڑے مکار اور خود غرض ہیں یہاں انسان کم اور درندے زیادہ بستے ہیں۔ چہرے پر انسانیت کا خول چڑھائے دان پونیہ کرنے والے راجہ اور رشی سب درندہ ہوتے ہیں"

بمبئی سے وہ سترہ سال بعد اپنے گاؤں چندر پور آئی تھی اس کے ساتھ اس کا جوان بیٹا سدھیر بھی تھا۔ آج کا چندر پور بالکل بدلا ہوا تھا سڑکیں پکی ہو گئی تھیں جن کے دونوں بازو مرکیوری لائٹ کے کھمبے تھے چھوٹے کچے مکانوں کی جگہ صاف ستھری کالونیاں بن گئی تھیں دو بڑے اسکول تھے اور ایک بڑا دواخانہ جہاں اس کا تقرر ہوا تھا۔ کہر میں لپٹی ہوئی آج کی شام بڑی سہانی تھی۔ کوہساروں سے اترتے ہوئے جھرنوں کا مدھر سنگیت، رنگ برنگی چڑیوں کے جھنڈ، روئی کے گالوں سے اڑتے ہوئے سفید بادل اور چاروں طرف پھیلا ہوا سبزہ زار۔ کرن برسوں بعد یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی گاؤں کی سوندھی سوندھی خوشبو اس کی روح کو تازگی بخش رہی تھی لیکن ماضی کی اذیت ناک یادیں اسے بے چین کرنے لگیں۔ وہ اپنی ان سوچوں کو کسی بھولنے والے احساس کے سپرد کرنے سے قاصر تھی۔ گلابی شام سرمئی دوشالہ اوڑھنے لگی تھی بادلوں کے بیچ کہیں کہیں ستارے جھانکنے لگے تھے جن کی جلتی بجھتی روشنی سے ایک ایک چہرہ ابھر رہا تھا۔ پریم کو وہ آج تک بھلا نہ سکی تھی من کے سنگھاسن پر وہ آج بھی براجمان تھا یہ وہی جگہ ہے وہی پیپل کا پیڑ وہی مست ہوائیں جیسے وہ پریم سے کہہ رہی " اے میری بھی مٹکی بھر دے نا"

جا جا میں نہیں بھرتا کیا میں نے سب کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟

جیسے کہیں دور سے پریم کی آواز آ رہی تھی "میرا ایک ڈول کس کس کی مٹکی بھرے گا؟

" تو نے آشا، لتا، روپا سب کی مٹکیاں بھر دیں میں نے تیرا کیا کیا ہے رے؟

"یہی تو کہتا ہوں تو نے کچھ کیا ہی نہیں کل میں نے تجھے آنکھ مچولی کھیلنے بلایا تھا تو کیوں نہیں آئی؟

" میں آکر کیا کرتی میرے ساتھ کوئی نہیں کھیلتا سب مجھے مار کر بھگا دیتے ہیں"

"تیرے ساتھ کوئی نہیں کھیلتا تو میں بھی کسی کے ساتھ نہیں کھیلوں گا نہ کسی کو کھیلنے دوں گا تو آکر تو دیکھ نا"

" اچھا بابا آجاؤں گی اب تو بھر دے نا"

" دیکھ کرن تو ہر وقت خوشامد کر کے مٹکی بھروا لیتی ہے اور کبھی وعدہ پورا

نہیں کرتی جا آج تجھے بالکل پانی نہیں ملے گا"

"ارے اتنا تو نہ ستایا کر ہمیں گاؤں والے کنوئیں سے پانی لینے نہیں دیتے ورنہ تیری اتنی خوشامد کون کرتا آج میں جرور آؤں گی اب تو بھر دے نا دیر ہو جائے گی تو باپو ماریں گے" پریم نے مٹکی بھر دی وہ اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے مٹکی اٹھائے گھر کی طرف چل دی پریم اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا

پریم لالہ رام ناتھ کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا جن کی گاؤں میں بہت بڑی دوکان تھی۔ پریم مردانہ حسن اور محبت بھرے دل کا مالک ہریجن حسینہ کرن کا دیوانہ تھا۔ کرن گاؤں والوں کے برتاؤ سے خوفزدہ رہتی تھی پریم سے پیار کرتی لیکن اس سے دور دور رہتی تھی۔ ایک دن پھر اس نے کرن کو روک لیا "او کرنا! کہاں چلی رے؟ کتنے دن بعد نظر آئی اور بنا بات کئے جا رہی ہے" پریم کی آواز پر کرن نہیں رکی سر جھکائے چلی جا رہی تھی پریم تیزی سے قریب آیا "کیا بات ہے رے کیا تو مجھ سے ناراض ہے کنوئیں پر آنا چھوڑ دیا کیا اسکول بھی جانا بند کر دیا؟"

"پریم اب تو مجھ سے نہ ملا کر ماں کہتی ہے میں بڑی ہو گئی ہوں مجھے لڑکوں سے بات نہیں کرنا چاہیے باپو روز اسکول چھوڑتے ہیں اور شام سہلیوں کے ساتھ واپس آتی ہوں۔ پانی کبھی ماں کبھی باپو لاتے ہیں" "کرن تجھ سے ملے بنا دل مانتا ہی نہیں تو کسی بہانے آ جایا کر۔ کیا تو اب ٹھاکر کے گھر کام پر نہیں جا رہی ہے؟" "کام پر نہیں گئی تو پڑھائی کے لئے پیسہ کہاں سے آئے گا؟ کسی سے بات کرتے باپو نے دیکھ لیا تو کام بھی بند ہو جائے گا اسکول بھی بند ہو جائے گا میں نہیں آؤں گی" "اے تو ہمیشہ باپو کا ڈر کیوں بتاتی ہے چل میں تیرے باپو سے آج ہی بات کروں گا اور تجھے گھوڑے پر بٹھا کر اپنے گھر لاؤں گا"

"پریم کیا دیوانہ ہو گیا ہے؟ تم لوگ بڑے اور اعلی ذات کے ہو ہم غریب نیچ ذات والے ٹھیرے ہمارا تمہارا میل کیا؟" وہ تیز تیز قدم اٹھاتی جانے لگی۔ پریم نے راستہ روک لیا "ایسا ہی ہے تو تو تھوڑے دن اور صبر کر لے میں میٹرک پاس کر کے بمبئی چلا جاؤں گا وہاں نوکری کروں گا پھر تجھے ڈولی میں بٹھا کر وہاں لے جاؤں گا اور تجھے خوب پڑھاؤں گا"

"کیا تو مجھے ڈولی میں بٹھا کر لے جائے گا؟ دلہن بنا کر"

"اور نہیں تو کیا بھگا کر لے جاؤں گا"

"دیکھ پریم پہلے تو تیرے لوگ ہماری شادی ہونے نہیں دیں گے اور شادی ہو گئی تو میں ڈاکٹر کیسے بنونگی؟"

"وقت آنے پر تجھے سب سمجھا دوں گا بس اتنا یاد رکھ تجھے میری دلہن بننا ہے اب تو گھر چلی جا کل کام پر جاتے وقت پھر ملنا"

اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اور بھاگ گئی۔ ٹھاکر کی حویلی رنگین قمقموں سے جگمگا رہی تھی اس کی آن بان دیکھ کر لوگ پھولے نہ سما رہے تھے اور غریب ٹھنڈی آہیں بھر رہے تھے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہی روشنی کسی غریب کے مقدر کا اندھیرا بن جاتی ہے۔ کرن کو بھی ٹھاکر کی بیٹی کی شادی پر کپڑوں کا بھاری جوڑا بنایا گیا تھا اس نے بھی دلہن کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں مہندی رچائی تھی بالوں میں گجرا سجایا تھا وہ بے حد خوش تھی۔ بارات قریب آ رہی تھی لڑکیوں کے ساتھ وہ بھی بارات دیکھنے اوپر جا رہی تھی وہ سب سے پیچھے رہ گئی تھی کہ ٹھاکر کے چھوٹے بیٹے راج پال نے اسے سیڑھیوں پر روک کر ایک گلاس دودھ اس کے کمرے میں پہنچانے کہا۔ اور جب وہ دودھ لے کر کمرے میں پہنچی راج پال نے لپک کر دروازہ بند کر دیا کرن نے شور مچایا لیکن اس کی آواز سننے والا کوئی نہ تھا بارات گیٹ پر آ گئی کان پڑے آواز سنائی نہ دے رہی تھی اور آواز کے اس طوفان میں کرن کی عزت کا انمول موتی بہہ گیا وہ لٹی لٹی گھر کی طرف لوٹ گئی۔ ماں نے بیٹی کی اجڑی اجڑی سی حالت دیکھی کلیجہ تھام لیا۔ دوسرے دن اسے اپنی بہن کے ہاں بھیج دیا۔ اس وقت سے آج تک وہ انتقام کی آگ میں جلتی رہی تھی۔ رات اپنا سیاہ آنچل کائینات پر پھیلا چکی تھی کرن اس وقت چونکی جب گاؤں کے کمہار دادا نے اسے مخاطب کیا "ڈاکٹر بیٹیا رات ہو چکی ہے اور تم یہاں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو؟" "ہاں رامو دادا سدھیر ابھی تک نہیں آیا اسی کی راہ دیکھ رہی ہوں" "رامو دادا ایک بات بتاؤ! مجھے آئے ہوئے ہفتہ دس دن گزر گئے پریم نظر نہیں آیا کیا وہ اب اس گاؤں میں نہیں رہتا" "وہ یہیں رہتا ہے اپنی بہن کو لانے پڑوسی گاؤں گیا ہے۔ آج ہی آ گیا ہوگا۔" "کیا اسکے بیوی بچے ہیں؟" "کیا تمہیں نہیں

معلوم اس نے آج تک شادی نہیں کی ؟اسی وقت کرن کی نظرایک ایسے شخص پر پڑی جسے دیکھ کر وہ دم بخود رہ گئی لمبا قد کسرتی بدن عمر چالیس کے لگ بھگ وہ اسی طرف تیز تیز آرہا تھا۔ کرن کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا کرن بھی پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہی تھی پیشانی پر فکر وتردد کی شکنیں، گردش زمانہ کو تکتی ہوئی بجھی بجھی آنکھیں اور سر میں چاندی کے بال دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا کرن کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اس نے سر جھکا لیا۔ پریم کی آنکھوں میں تڑپتے سوالوں کا جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔

" تمہیں میری زندگی کے ساتھ کھیل کر کے کیا ملا؟ پریم کے لہجہ میں پھنکار تھی

" میں مجبور تھی پریم اس قدر مجبور کہ تمہیں کچھ نہ بتا سکی قسمت نے تو میرے ساتھ مذاق کیا تھا میں اتنی گر گئی تھی کہ تم سے آنکھ ملانے کے قابل نہیں تھی! یہاں بیٹھو پریم تمہیں آج سب کچھ بتادوں گی اپنے دل کی آگ بجھالوں گی۔ پریم یہ دنیا والے بڑے مکار اور خود غرض ہیں یہاں انسان کم اور درندے زیادہ بستے ہیں چہرے پر انسانیت کا خول چڑھائے دان پونیہ کرنے والے راجہ اور رشی سب اندر سے درندہ ہوتے ہیں ایسا ہی ایک درندہ چھوٹا ٹھاکر ہے جس نے اپنی بہن کی شادی کے دن میری عزت کا دامن تار تار کر دیا یہ وہ لوگ ہیں جو ہماری برادری کو نیچ اور گرا ہوا سمجھتے ہیں لیکن اسی کے جسم سے کھیلنے کو برا نہیں سمجھتے۔ ماں نے مجھے خالہ کے ہاں بھیج دیا اور وہاں سے میں بھیا کے پاس بمبئی بھیج دی گئی وہاں میں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ بھیا نے اپنی ہی برادری کے ایک لڑکے سے میری شادی کر دی وہ ایک سال بعد ہی چل بسا اور ایک لڑکا مجھے سونپ گیا۔" اتنے سالوں میں تم نے مجھے کبھی یاد نہیں کیا کبھی سوچا تک نہیں کہ پاگل پریم کس حال میں ہوگا بچپن کی محبت تم نے کس طرح دل سے مٹا دی ؟

" پریم زندگی کے کسی موڑ پر بھی میں تمہیں بھلا نہ پائی بس تمہارے سامنے آنے کی ہمت نہیں تھی مجھے معاف کر دو "

" تمہارا لڑکا کہاں ہے کیا نام ہے اس کا ؟

" اسکا نام سدھیر ہے۔ آج ہی رامودادا نے بتایا کہ وہ جب سے یہاں آیا ہے اسی ظالم

اور مغرور چھوٹے ٹھاکر کی بیٹی کے ساتھ آم کے باغ میں گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے جس نے میری زندگی برباد کر دی تھی۔"

"ہاں کرن ظلم کا انت ایک دن ہو جاتا ہے اور ظالم اپنی سزا پاتا ہے"۔

فیصلہ

لئے پھرتی ہے مجھے اس کی آرزو اختر
تلاش یار میں شام و سحر رہا ہوں میں
نشان منزل مقصود خاک بھی نہ ملا
تمام عمر سر رہگزر رہا ہوں میں
مگر یہاں تو مجھے بوئے یار آتی ہے
کشش سی قلب میں محسوس کر رہا ہوں میں

(جانثار اختر)

اس نے اعجاز کے عزم محکم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے وہ سوچتی رہی کہ اپنے جذبات کی رنگین دنیا پر پوری طرح اس کا قبضہ تھا پھر آج زندگی کے اس موڑ پر جانے کیوں یہ دل بہکنا چاہتا ہے پھسلنا اور ڈوب جانا چاہتا ہے ورنہ سر راہ مل جانے والوں کو زندگی کا ساتھی کیوں کر بنایا جا سکتا ہے۔

اعجاز کی گاڑی کا ہارن سن کر جنید اس کے اندر آنے کا منتظر تھا لیکن چند منٹ تک وہ اندر نہیں آیا جنید خود باہر گیا تو اسے عالم محویت میں بے حس و حرکت کھڑا گیٹ کی طرف دیکھتا ہوا پایا جنید نے آواز دی تو وہ چونک پڑا " جنید یہ...... یہ خاتون کون تھی جو سفید کپڑوں میں ملبوس ابھی ابھی باہر گئی ہے ؟" کیوں کیا اس عمر میں بھی عاشقی کرو گے ؟" او۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ اس عمر میں عاشقی کرنا منع ہے " اعجاز نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔" پھر بھی میں جاننا چاہوں گا یہ کون ہے یوں لگتا ہے اس چہرے کو کبھی بہت قریب سے دیکھا ہے شاید میری کلاس میٹ رہی ہو اسے دیکھ کر اپنی جوانی کا زمانہ یاد آیا" اعجاز نے سنبھلتے ہوئے کہا۔" یار اندر چل کر بیٹھو تو سہی " بیٹھتے ہوئے جنید نے بتایا کہ زندگی کی بازی ہاری ہوئی یہ غمزدہ عورت اس کی بیوی کی چچازاد بہن سائرہ ہے جس کے محبوب کی ماں نے اسے ٹھکرادیا تھا۔ والدین گزر چکے ہیں وہ اپنی زندہ لاش کو اپنے کندھوں پر اٹھائے زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ اعجاز بت بنا سن رہا تھا۔ وہ سوچوں کے سمندر میں غرق تھا یہ کیسی محبت تھی جس نے سود و زیاں کا کوئی حساب نہ رکھا تھا محبت میں سود و زیاں ہوتا ہی کہاں ہے محبت کا فلسفہ تو سب سے اچھوتا اور نرالا ہوتا ہے جسکا پہلا سبق یہ ہے کہ سب کچھ دیدے اور کچھ بھی نہ لے اعجاز کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس کی پرسکون لیکن بے کیف سی زندگی میں زلزلہ سا آگیا تھا آج اس نے اسی ہستی کو دیکھ لیا تھا جسے دیکھنے کو گزشتہ بیس سال سے اس کی آنکھیں ترس رہی تھیں جذب و کیف کی منزل سے گزرتے ہوئے اس کا ذہن ماضی کے دھندلکوں میں کھو گیا۔ بہار کی ایک خوش گوار شام اسے آج بھی یاد ہے اس دن یزدانی کے آرٹ کی نمائش تھی۔ رنگوں کی دھنک سے سجائے گئے قدرتی مناظر کا وہ شیدائی تھا جب بھی انٹرنیشنل آرٹ گیلری سنٹر میں اس قسم کی نمائش لگتی وہ ہر کام چھوڑ کر وہاں چلا جاتا اور گھنٹوں پینٹنگز سے محظوظ ہوتا رہتا۔ اس دن وہ گھومتا ہوا ایک پینٹنگ کے سامنے کھڑا ہو گیا اس کے کنوارے جذبات کے سمندر میں ایک انجان سی ہلچل مچ گئی تھی سرو جیسا قد، بل کھاتی ہوئی گھنی زلفیں لبوں پر کھلا کھلا سا معصوم تبسم، گلابی رخسار، جھکی جھکی پلکوں کے نیچے مخمور آنکھیں، بھرے بھرے جسم پر انگڑائیاں لیتا شباب لیکن چہرے پر سوگواری کی

ہلکی سی لکیر نے حسن جہاں سوز میں کچھ اور اضافہ کر دیا تھا۔ اعجاز عالم بے خودی میں جانے کتنی دیر تک اس تصویر کے آگے کھڑا رہا جب وہ باہر نکلا شام کے دھندلکے سیاہی میں بدل رہے تھے وہ تین دن تک ہر روز کالج سے نکل کر آرٹ گیلری چلا جاتا اور اس تصویر کے آگے جا کھڑا ہوتا۔ جیسے وہ اس طلسم ہوشربا کو آنکھوں کی راہ اپنی نس نس میں بسا لینا چاہتا ہو نمائش ختم ہوتے ہی وہ یزدانی کے گھر جا پہنچا اور تصویر والی دوشیزہ کے بارے میں استفسار کیا تو یزدانی نے کہا کہ وہ اس لڑکی کے بارے میں کچھ کہنے سے قاصر ہے اتنا ضرور بتایا کہ وہ ایک اوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہے فسادات میں سب کچھ لٹ گیا جوان بھائی مارے گئے ضعیف والدین کی غذا اور دوا کے لئے اسے ماڈلنگ کا کام کرنا پڑا اور اب اسے ایک مقامی اسکول میں ملازمت مل چکی ہے۔ اعجاز کے لئے اتنا جان لینا کافی تھا۔ وہ شہر کے سرکاری و غیر سرکاری چھوٹے اور بڑے اسکولس کے چکر لگاتا رہا۔ گزرتا ہوا ہر دن اسے محرومی کا تلخ احساس دیتا رہا کہتے ہیں جذبہ دل صادق ہو تو منزل یقیناً مل جاتی ہے محرومیوں و مایوسیوں کی گرد سے دھندلایا ہوا چہرہ لئے وہ ایک اسکول کے سامنے کھڑا ہوا باہر نکلنے والی ٹیچرز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت دو برقعہ پوش خواتین اسکول کے گیٹ سے نکل کر سڑک پار کر رہی تھیں کہ ایک سمت سے آنے والی تیز رفتار اسکوٹر کی زد میں آگئیں ایک تو اچھل کر بچ گئی لیکن دوسری خاتون اوندھے منہ لڑھک گئی اور اس کے سر سے برقعہ کی چادر ہٹ گئی وہ حواس باختہ سی اٹھی اور برقعہ و بیگ سنبھالتی ہوئی کھڑی ہوئی لیکن چیخ مار کر پھر بیٹھ گئی شاید اس کے پیر میں موچ آ گئی تھی۔ لوگ جمع ہو گئے لڑکی اپنے آپ کو سنبھال رہی تھی ادھر اعجاز اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا وہی حسن مجسم اس کے سامنے تھا جس کی تلاش میں وہ گلی گلی کوچہ کوچہ گھومتا رہا تھا اسے یوں لگا جیسے زم[illegible] تھم
گئی ہو کائنات کی ہر شئے حیرانی میں ڈوب گئی ہو حیرت اور مس
اس کے خون میں گردش کر رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت و
زخمی لڑکی کو ایک آٹو میں بٹھا چکی تھیں جیسے ہی آٹو اسٹا
انداز میں اپنی کار اسٹارٹ کی اور آٹو کے ساتھ چل پڑا۔ دو
کے ٹخنہ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور اسے چند دن دواخانہ

اعجاز کے لئے مسرت بن گئی۔ وہ اس کی خدمت کرنا اور اس کے دیدار سے اپنی روح
کو سرشار کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے دن ضرورت کی کچھ چیزیں اور فروٹس وغیرہ لئے
دھڑکتے دل کے ساتھ وہ دواخانہ پہنچ گیا۔ اپنا تعارف کرواتے ہوئے آرٹ گیلری کی
تصویر اور اپنی تلاش و جستجو کا حال سنایا۔ وہ حیرانی کے عالم میں اسے تکتی رہی اپنی
بصارت و سماعت پر جیسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس قدر خوبرو وجیہ امیرو کبیر نوجوان
اس کے لئے اتنے والہانہ جذبات رکھتا ہے دوشیزہ کی زبان جیسے گنگ ہوگئی بڑی
مشکل سے اسنے حواس مجتمع کئے اور گویا ہوئی " مسٹر اعجاز میں خواہ مخواہ کسی کی
ہمدردیوں اور احسانات کی زیر بار ہونا نہیں چاہتی میں ایک غریب لڑکی ہوں اپنی
اور اپنے خاندان کی عزت مجھے اتنی عزیز ہے جتنی کسی شریف لڑکی کو ہوتی ہے میں
ہمدردی کے لئے آپ کی ممنون ہوں " اعجاز اس کی باتیں سن کر بوکھلا گیا۔ چند لمحے
پلکیں جھپکاتا دیکھتا رہا پھر ایک اسٹول پر بیٹھتا ہوا بولا۔ " آپ مجھے غلط نہ سمجھیں
دراصل میں نے جب آپ کی تصویر دیکھی تھی اس وقت یہ احساس ہوا کہ مجھے میرا
آئیڈیل مل گیا ہے بڑی تلاش و جستجو کے بعد آپ کو پاسکا ہوں " لڑکی اعجاز کو بیٹھتا ہوا
دیکھ کر اٹھ بیٹھی اپنا ڈوپٹہ اور بال ٹھیک کرتے ہوئے کہا " جناب آپ غلط طریقہ سے
اپروچ ہورہے ہیں اور غلط مقام پر آگئے ہیں آپ کو یہ صاف صاف بتادوں کہ میں کسی
دولت مند سے شادی کر کے اپنے ماتھے پر بدنامی کا داغ لگانا نہیں چاہتی مہربانی فرما کر
آپ چلے جائیں اور پھر کبھی مجھ سے ملنے کی تکلیف نہ کریں " لڑکی نے اپنا رخ دوسری
طرف پھیر لیا۔ اعجاز نے بڑے صبر کے ساتھ اس کی تقریر سنی لیکن وہ تو کبھی نہ ابھرنے
کے لئے اس کی محبت میں ڈوب چکا تھا اس نے لڑکی کی تلخ و ترش گفتگو کو حسن کی ایک
ادا سمجھا۔ چہرے پر ایک بھرپور عزم لئے اٹھا زحمت کی معافی چاہتے ہوئے چلا گیا۔ جاتے
جاتے نرس سے اس کا نام اور پتہ لیتا گیا۔ دوسرے دن اس کے گھر پہنچ گیا جہاں اس
لڑکی کے والدین اپنی قسمت کا ماتم کر رہے تھے۔ اعجاز نے اپنا تعارف کرایا اور اپنے
آنے کا مقصد بتایا۔ والدین نے محسوس کیا کہ ان کے گھر رحمت کا فرشتہ آگیا ہے
انہوں نے اس کی پیش کش کو بصد شوق قبول کیا اور یہ بھی بتادیا کہ وہ لوگ اس کے
قابل نہیں ہیں لیکن اعجاز نے انہیں سمجھایا کہ وہ خیالات کو اپنے ذہن سے نکال دیں

اور سب کچھ اس پر چھوڑ دیں وہ ہر روز سائرہ کی مزاج پرسی کے لئے جاتا رہا۔یہاں تک کہ اس نے اعجاز کے عزم محکم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے وہ سوچتی رہی کہ اپنے جذبات کی رنگین دنیا پر پوری طرح اس کا قبضہ تھا پھر آج زندگی کے اس موڑ پر جانے کیوں یہ دل بہکنا چاہتا ہے پھسلنا اور ڈوب جانا چاہتا ہے ورنہ سرراہ مل جانے والوں کو زندگی کا ساتھی کیوں کر بنایا جاسکتا ہے سائرہ اعجاز کی دیوانگی کو اس کی آنکھوں میں دیکھ چکی تھی۔ کتنا خوبصورت ہوتا ہے وہ لمحہ جب یہ احساس ہوجائے کہ ہم بھی کسی کی زندگی بن چکے ہیں کوئی ہمیں بھی دل وجان سے پیار کرتا ہے۔وہ دواخانہ سے جب گھر آئی تو اعجاز کی طرف سے ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا۔اعجاز کی والدہ بیگم نواز احمد کو بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔وہ اپنی امیرانہ آن بان کے ساتھ آئیں سائرہ اور اس کے والدین سے مل کر خوش ہوئیں۔پارٹی کا انتظام دیکھ کر محظوظ ہوئیں۔جب اعجاز نے ان سے یہ کہا کہ وہ سائرہ کو ان کی بہو بنانے کا فیصلہ کر چکا ہے تو وہ آپے سے باہر ہوگئیں کیونکہ وہ لوگ ان کے برابر والے نہیں تھے وہ تو کسی امیر کبیر گھرانے کی لڑکی کو اپنی بہو بنانے کے خواب سجائے بیٹھی تھیں جو اپنی دولت وامارت کی چمک دمک سے دیکھنے والوں کی آنکھوں کو چکاچوند کردے۔سائرہ جو شاداں وفرحاں کام میں مصروف تھی قریب سے گزرتے ہوئے اعجاز کی والدہ کی تیز گفتگو سن لی اس کے نازک اور غیور دل پر بجلی سی گری اور وہی ہوا جس کا اسے خوف تھا ایک غریب، امیروں کے دربار سے دھول کی مانند جھٹکا جا چکا تھا۔سائرہ نے ضبط سے کام لیا رات گیارہ بجے پارٹی اختتام کو پہنچی۔تیسرے دن اعجاز نے زاد چہرہ اور ویران انکھیں لئے سائرہ کے گھر گیا تو اس نے ملنے سے انکار کردیا۔بار بار یہی ہوتا رہا اور ایک دن وہ سب علی گڑھ چلے گئے یہ خبر اعجاز کے لئے ایک دھماکے سے کم نہیں تھی۔دکھوں حسرتوں، پشیمانی اور محرومی کی نمی آنکھوں میں لئے بوجھل قدموں سے گھر لوٹ گیا ایک عرصہ اسی آگ میں جلتے جھلستے گزر گیا۔والدین نے سمجھایا وہ سائرہ کو بھول جائے حادثات تو زندگی میں ہوتے ہی ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو فراموش کردیا جائے ہر شخص کے ساتھ کوئی نہ کوئی المناک کہانی منسوب ہوتی ہے غم کے پہاڑ بھی ٹوٹ پڑتے ہیں لوگ پھر بھی جی لیتے ہیں، حالات سے سمجھوتہ

کر لیتے ہیں لہذا اسے بھی اپنی زندگی کا رخ موڑنا ہی پڑے گا۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ کلب چلنے پر رضامند کیا۔ کلب کی رنگین فضاؤں نے اس کے زخم پر مرہم رکھا وہ آہستہ آہستہ بدلنے لگا اور ایک دن والدین کے کہنے پر اپنی خالہ زاد بہن صبیحہ سے شادی کے لئے تیار ہو گیا اور آج وہ چار بچوں کا باپ تھا اس کی کنپٹیوں پر چاندی کے بال نمودار ہو چکے تھے گو اس کی محبت ماضی کے دھندلکوں میں کھو چکی تھی لیکن وہ سائرہ کی یاد کو اپنے دل سے دور نہ کر سکا تھا وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے لیکن کچھ زخم ایسے بھی ہوتے ہیں جو وقت کی مسیحائی کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں صبیحہ میں وہ صلاحیت بھی نہیں تھی جو ایک شوہر کے دل کو جیت سکتی بس اپنے اپنے خول میں بند وہ زندگی کی راہوں پر خاموشی کے ساتھ چلتے رہے تھے۔ بچے بڑے ہو گئے تھے اور وہ اپنے پپا کے دل کو جیتنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ اپنے پپا کو ایک آئیڈیل باپ ہی نہیں اپنا دوست بھی سمجھتے تھے جب تک پپا گھر نہیں آتے کھانے کی میز نہیں لگتی۔

شہر میں پینٹنگز کی نمائش لگی تھی اعجاز اپنے ساتھ جنید کو لیجانے کی غرض سے آیا تھا اور اس کے گھر پر ایک حور مقدس کو دیکھ کر سانس تک لینا بھول گیا تھا وہ ماضی کے کربناک اندھیروں سے اس وقت باہر نکلا جب مسز جنید چائے لئے اندر داخل ہوئیں اعجاز کو گم صم دیکھا اور اس کے گالوں پر آنسوؤں کی دو لکیروں نے انھیں بوکھلا دیا۔ جنید بھی آگیا "کیا ہوا اعجاز یہ بت بنے کیوں بیٹھے ہو؟ اعجاز نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے "جنید ابھی ابھی تم نے جو کہانی ادھوری چھوڑی تھی وہ پھر سے شروع ہو گئی ہے" وہ کیسے؟" سائرہ کے جس محبوب کا تم نے ذکر کیا تھا وہ بد نصیب میں ہی ہوں سائرہ دراصل ایک بزدل لڑکی تھی وہ اس وقت مجھے چھوڑ گئی جب میں زمانے کے گرداب میں پھنسا اس کے لئے ہر طوفان سے ٹکرا جانے کا تہیہ کئے بیٹھا تھا اس نے خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی اور میری زندگی کو جہنم بنا ڈالا۔ اب میں اندھیرے اجالے کے اس سنگم پر کھڑا ہوں جہاں سے مجھے ایک راہ کا تعین کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے سارے دکھ سمیٹ لوں زمانے بھر کی خوشیاں اس کے قدموں میں ڈال دوں"

۔۔۔" اعجاز آج تم جوان بچوں کے باپ ہو وہ تمہاری شفقت اور سرپرستی کے طلب گار ہیں سائرہ تک پہنچنے کے لئے اب تمہیں آگ کا دریا پار کرنا ہوگا۔ اسی وقت سائرہ

باہر سے آگئی اس کی نظر اعجاز پر رک گئی وہ جہاں کی تہاں کھڑی ہو گئی ۔ اس پر غشی طاری ہونے لگی تھی جنید نے بڑھ کر اسے سنبھال لیا ۔ وہ جب ہوش میں آئی تو دیکھا کہ اس کی روٹھی ہوئی زندگی اس سے گلے مل رہی تھی وقت اس پر مہربان ہو گیا تھا وہ اعجاز کی دلہن بنادی گئی ۔ اعجاز کا زیادہ وقت سائرہ کے ساتھ گزر رہا تھا اور اس کے گھر میں پر ہول سناٹا چھا گیا تھا بچے خاموش اور دل گرفتہ تھے ۔ ان کے پپا کا راز ان پر عیاں ہو گیا ان کے معصوم دلوں اور ہنستی کھیلتی زندگی پر یہ خبر بم کی صورت گری اور گھر میں قیامت برپا ہو گئی ۔ چودہ سالہ بیٹی نے تڑپ کر باپ سے کہا " پپا کہہ دو کہ یہ خبر غلط ہے دنیا والے جھوٹ کہہ رہے ہیں وہ ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں انہیں منع کر دو پپا انہیں منع کر دو " وہ پھوٹ پڑی غیظ و غضب میں ڈوبا ہوا بڑا بیٹا آگے بڑھا باقی دو اس کے پیچھے تھے " پپا ہم نے جو کچھ بھی سنا ہے کیا وہ سچ ہے ؟ جواب دیجئے ! دوسرے بیٹے نے کہا " پپا ہم نے آج تک کسی معاملے میں آپ سے کوئی سوال نہیں کیا لیکن آج ہمارے سوالوں کا جواب آپ کو دینا ہی پڑے گا " تیسرا بیٹا آگے بڑھا " پپا آپ کی خاموشی آپ کی زبان بن گئی ہے کیا آپ کو اقرار ہے کہ آپ نے ہمارے اور اپنے درمیان ایک دیوار کھڑی کر لی ہے جسے ہم ہرگز برداشت نہیں کر سکتے ماں کی حق تلفی ہم نہیں دیکھ سکتے "

دل و جان سے باپ کو چاہنے والی اولاد آج بدل گئی تھی آج آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی تھی ۔ صبیحہ اپنے ہتھیار ڈالے پھر لگائے تماشہ دیکھ رہی تھی ۔ باپ کی گمبھیر خاموشی اور سرخ ہوتا چہرہ دیکھ کر جوان بیٹے بھی مزید آگے نہ بڑھ سکے ۔ اعجاز اپنے کمرے میں ٹہل رہے تھے انہیں آج اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنا تھا ایک طرف بیٹوں کا غیظ و غضب اور بیٹی کا مستقبل تھا دوسری طرف سائرہ کی معصوم خاموشی اور خود اس کی اپنی خوشیاں جس کے لئے وہ برسوں تڑپتا رہا تھا ادھر بچوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یا وہ رہیں گے یا پھر دیوار رہیں گی ۔ صبح کے سورج کے ساتھ ہی انہوں نے باپ کا فیصلہ مانگا تھا ۔ رات بھر اس گھر میں کوئی نہ سو سکا تھا اور صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی بچے باپ کے کمرے میں آگئے خالی کمرہ اور بے شکن بستر دیکھ کر ٹھٹک گئے ۔ ٹیبل پر پیپر ویٹ کے نیچے باپ کا فیصلہ ان کا منہ چڑا رہا تھا ۔

بڑے بیٹے نے خط اٹھایا اور پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔

پیارے بچو

میں جانتا ہوں کہ تم لوگ رات بھر سو نہیں سکے ہو اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میرے کمرے میں آؤ گے۔ میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم نے جس دیوار کے بارے میں سنا ہے وہ دیوار نئی نہیں ہے یہ تو گزشتہ بیس برس سے میرے اور تم لوگوں کے درمیان کھڑی ہے اسے صرف میری ہی آنکھیں دیکھ سکتی تھیں وہ آج تمہاری آنکھوں کے سامنے آگئی ہے میں نے اسی دیوار کے سائے میں زندگی کے بیس سال گزارے ہیں۔ چونکہ مجھے تم سب کی خوشیاں عزیز تھیں اس لئے سائرہ کی محبت اور جدائی کے رستے ہوئے زخموں کو چھپائے میں تمہارے ساتھ ہنستا رہا ہوں اپنے دکھ کی پرچھائیاں تم پر نہ پڑنے دیں ایک کڑی آزمائش سے گزرنے کے بعد مجھے میری گمشدہ جنت ملی ہے اگر آج تمہیں میری خوشی منظور نہ ہو تو میں تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں گا اور اگر میری خوشی منظور ہو تو سات بجنے سے پہلے دریا کے کنارے آجانا ورنہ مجھے کبھی یاد نہ کرنا معاف کر دینا"

بچوں نے گھڑی پر نظر ڈالی سات بجنے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا تمہارا اپنا اپنا اور دریا کا راستہ آدھ گھنٹہ سے کم نہ تھا وہ سب ہوا کہ دوش پر اڑتے ہوئے دریا کے راستہ پر چل پڑے۔

فریب آرزو

سینے کے ویران گوشوں میں اک ٹیس سی کروٹ لیتی ہے
ناکام امنگیں روتی ہیں امید سہارے دیتی ہے

وہ راہیں ذہن میں گھومتی ہیں جن راہوں سے آج آیا ہوں
کتنی امید سے پہنچا تھا کتنی مایوسی لایا ہوں

ساحر

ارم نے پھر ایک بار ظالم تقدیر کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے اور فراز سے طلاق حاصل کر لی دل کا لہو آنکھوں کی راہ بن کر بہہ نکلا زندگی کے پلیٹ فارم پر کیسے کیسے مسافر ملتے اور بچھڑ جاتے ہیں کس قدر سفاک تھے وہ خواب جو ریزہ ریزہ ہو کر بکھرے تو ان کی کرچیوں نے اس کی روح کو تک زخمی کر ڈالا ان کرب انگیز لمحوں اور اذیت ناک گھڑیوں میں بارہا اس کا جی چاہا کہ سوچوں کی شدت سے چکراتا ہوا سر دیواروں سے ٹکرا دے اور ــــــــ

ارم ایک مصور تھی اسے نیلے آسمان کی وسعتوں سے بے پناہ پیار تھا وہ ان وسعتوں کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ لینا چاہتی تھی ۔ گھنٹوں خلاؤں میں گھورتی رہتی جیسے نیلے آسمان کو چھو لینا چاہتی ہو اسے قدرتی مناظر سے والہانہ لگاؤ تھا وہ چاہتی تھی کہ قدرت کی صناعی کے حسین پیکروں کو اپنے رنگ و برش کی مدد سے ہمیشہ کے لئے قید کر لے اور زندگی بھر انہیں دیکھتی رہے وہ بھی ہر جوان لڑکی کی طرح خوابوں کے ہنڈولوں میں جھولا کرتی ۔ کبھی کبھی انسان انتہائی خوبصورت خوابوں کو دل میں بسا لیتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ کبھی ان کی تعبیر کو پا بھی سکیں گے یا نہیں اکثر یہ خواب زندگی کا محور بن جاتے ہیں انہیں دل سے دور کرنے کی کوشش کریں تو یوں لگتا ہے جیسے گردش مدام یکلخت رک جائے گی ۔ ایک خواب اس کی بھی نس نس میں سما گیا تھا بچپن میں اسے کہانیاں سننے کا بڑا شوق تھا اس کی نانی امی پریوں اور شہزادیوں کی لمبی لمبی کہانیاں سنایا کرتی تھیں تب ہی سے وہ پھولوں ، بل کھاتی اچھلتی چھم چھم کرتی ندیوں کے شفاف ، گنگناتی رنگ برنگی چڑیوں اور تتلیوں کی شیدائی بن گئی تھی ۔ ایک حسین شہزادہ بھی اس کے دل کے نہاں خانے میں آ بیٹھا تھا ۔ یہ شہزادہ اس کا آئیڈیل تھا ۔ وہ مہذب ، بہادر ، وسیع النظر اور باوقار شخصیت کا مالک تھا وہ چاہتی تھی کہ وہ شہزادہ اس کے دل میں چھپے تمام جذبوں سے آشنا ہو اس کے اندر کے فنکار کی قدر کرتا ہو اس کی صورت و سیرت دونوں ہی خوبصورت ہوں ۔

ارم اپنے والدین کی اکلوتی نور نظر تھی ۔ ماں باپ نے اسے خوش رکھنا اور خوش دیکھنا اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا ۔ والد نے اس کے لئے ایک خوبصورت باغ لگایا تھا ۔ سبزی مائل نیلے پانی کی چھوٹی سی نہر پورے باغ میں پھیلی ہوئی تھی ۔ نہر میں ہنس کے جوڑے نہر کے حسن کو دوبالا کرتے تھے ۔ جرمن ڈیزائن کا ایک خوبصورت بنگلہ تھا جو چاروں طرف سے پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا ۔ بنگلے کی ایک جانب ایک بڑے کشادہ پنجرہ میں رنگ برنگ کے پرند تھے ۔ شہزادی اپنی جنت ارضی میں بہت خوش تھی ۔ مقدر پر کس کا بس چلا ہے کبھی کبھی خوشیاں بام عروج پر پہنچ کر پامال بھی ہو سکتی ہیں ۔ اس کے والد کار کے حادثہ میں ایسے زخمی ہوئے کہ سب سے ناطہ ہی توڑ لیا ۔ ماں بیٹی کی خوشیوں کا چاند ایسا گہنا گیا کہ چار سو اندھیرا پھیل گیا ۔ ایک بجلی سی

کڑکی اور مہیب سناٹا چھا گیا۔ ماں نے اپنے بھائی کی رفاقت میں زندگی گزارنا چاہا اور ان کے ہاں جا رہیں۔ بھاوج کی نظر اپنی نند کی دولت پر شروع ہی سے تھی۔ اس نے کسی طرح اپنے میاں کو رضامند کر لیا کہ وہ ارم کو اپنے سالے رشید کے لئے مانگ لیں ارم نے اپنی ماں کی مرضی پر اپنے آئیڈیل کو قربان کر دیا اور خاموشی کے ساتھ ایک معمولی ٹیچر کی بیوی بن گئی۔ رشید ابتدا۔ میں اس کی محبت کا دم بھرتا اس کے حسن وفن کی تعریف کرتے نہ تھکتا تھا۔ چند دن بعد پتہ چلا کہ وہ ایک دل پھینک عاشق ہے ایک بھونرا جس کی عادت ہر نو خیز کلی کا رس پینا اور اڑ جانا ہے۔ پریوں کی شہزادی کا حسن ماند پڑنے لگا وہ جب دو بچوں کی ماں بن گئی پھر ایک بار بجلی قہقہہ مار کر ارم کے آشیانہ پر گر پڑی۔ چار سال میں اس کے ماموں اور ماں نے ایک کے بعد ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا ممانی نے اسے منحوس کا نام دے کر بچوں سمیت گھر سے نکال باہر کیا اور بھائی کو ایسی پٹی پڑھائی کہ اس نے ارم کو طلاق بھی دیدی۔ محلوں کی شہزادی گلیوں میں بھٹکنے لگی کسی نے اس پر رحم کھا کر ایک اسکول میں ملازمت دلادی۔ زندگی جو کبھی پھولوں کی سیج تھی اب کانٹوں کا بستر بن چکی تھی حالات کے زہریلے ناگ پھن اٹھائے اس کا پیچھا کر رہے تھے اسکول کی ہیڈ مسٹرس نے اسے کچھ ٹیوشنس بھی دلادئے تھے وہ اسے اکثر دوسری شادی کے لئے مجبور کرتی اور سمجھاتی کہ بچوں کے لئے باپ کی سرپرستی لازمی ہے ایک اکیلی عورت جوانی کے بوجھ کے ساتھ اولاد کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی زندگی گزارنے کے لئے ایک ہمدرد و مخلص ساتھی کا ساتھ ضروری ہے کئی مہینوں کی سوچ و فکر کے بعد ارم نے فراز کو اپنی تنہائیوں کا ساتھی بنانا منظور کر لیا اس کا وسیع بزنس تھا وہ ایک بیوی کا شوہر اور چار بچوں کا باپ تھا جب فراز کی بیوی کو معلوم ہوا کہ اس کی زندگی کے سمندر میں مدو جزر پیدا ہو گیا ہے تو وہ طوفان بن گئی وہ ہر شئے کو تہہ و بالا کرنے پر تل گئی اس نے ارم کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے ہر اوچھے قسم کا ہتھیار استعمال کیا یہاں تک کہ فراز کے بزنس کو بھی تہہ و بالا کر ڈالا۔ ارم نے پھر ایک بار ظالم تقدیر کے آگے گھنٹے ٹیک دیئے اور فراز سے طلاق حاصل کر لی۔ دل کا لہو آنکھوں کی راہ پانی بن کر بہہ نکلا زندگی کے پلیٹ فارم پر کیسے کیسے مسافر ملتے اور بچھڑ جاتے ہیں۔ کس قدر سفاک تھے وہ خواب جو ریزہ ریزہ ہو کر

بکھرے تو ان کی کرچیوں نے اس کی روح کو تک زخمی کر ڈالا۔ان کرب انگیز لمحوں اور اذیت ناک گھڑیوں میں بارہا اس کا جی چاہا کہ سوچوں کی شدت سے چکراتا ہوا سر دیواروں سے ٹکرا دے اور ہر خیال، ہر احساس و سوچ سے ہر یاد سے بیگانہ ہو جائے۔ اس نے پھر اسی اسکول میں ملازمت کرنی شروع کر دی جہاں ہیڈ مسٹرس کی جگہ اب ہیڈ ماسٹر نوید احمد تھے۔چالیس بیالیس سالہ نوید ایک پر کشش شخصیت کے مالک تھے۔اور کئی ٹیچرس کے دل کی دھڑکن بن چکے تھے۔فرصت کے اوقات میں اکثر نوید ہی ٹیچرس کا موضوع گفتگو ہوتے وہ ان کی ایک ایک خوبی کو سراہتیں ثمینہ اس کے دراز قد پر مرمٹی تھی صالحہ اس کی کشادہ پیشانی اور گھنگریالے بالوں کی دیوانی تھی۔ شاذیہ ان کی بڑی بڑی ذہین اور مخمور آنکھوں کے نشہ میں ڈوب چکی تھی۔ارم ان سب سے الگ تھلگ کچھ نہ کچھ پڑھنے میں مصروف رہتی اسے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔وہ نوید کی پر وقار شخصیت سے متاثر ضرور تھی جب بھی اس کا سامنا ہو جاتا وہ گڑ بڑا جاتی اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے جلدی سے سلام کے لئے ہاتھ اٹھا دیتی وہ اکثر دن میں دو بار سلام کر لیتی اور اس وقت نوید احمد کے لبوں پر ایک مخصوص مسکراہٹ رینگنے لگتی۔اس مسکراہٹ کے ساتھ ہی ارم کے دل کے سوئے ہوئے تار جھنجھنا اٹھتے اور تب ہی اس کے تصور میں اس کا وہ آئیڈیل وہ شہزادہ گھوم جاتا جو اس کے دل میں چھپے تمام جذبوں سے آشنائی رکھتا ہو۔نوید اس کے حواسوں پر چھاتا چلا گیا لیکن اس نے بھی ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے تمام جذبات و تمناؤں کا گلا گھونٹ دے گی انہیں روح کی گہرائیوں میں دفن کر دے گی۔سالانہ چھٹیاں ہونے میں ایک ماہ باقی تھا وہ کچھ سوچ کر پر سکون ہو گئی۔

عید الفطر سے ایک دن قبل اچانک نوید آگئے حیرانی اور سراسیمگی کے عالم میں اسے کچھ سجھائی نہ دیا اس کا دل بے ترتیبی سے دھڑک رہا تھا اس نے بمشکل کہا "آپ ۔۔۔؟آپ نے غریب خانہ پر آنے کی تکلیف کیسے کی؟ آیئے تشریف لایئے" "میں تمہارا زیادہ وقت لینے نہیں آیا یہ کچھ کپڑے وغیرہ بچوں کے لئے ہیں رکھ لو تو مجھے خوشی ہو گی" نوید نے کہا۔ارم کچھ سمجھ بھی نہ پائی تھی کہ نوید ایک بڑا سا پیکٹ میز پر رکھ کر چلا گیا وہ کبھی پیکٹ کو اور کبھی دروازے کے ہلتے ہوئے پردہ کو دیکھتی رہی جو نوید کے

جانے کے بعد تھرتھرا رہا تھا۔ نوید تم نے مجھے مضطرب کر دیا ایسا کیوں کیا؟ کیا بے سکونی میری زیست کا جزو لازم بن چکی ہے؟ یہ کیسا مذاق ہے؟ میں یہاں سے دور چلی جاؤں گی اتنی دور کہ کسی کے خیال کی پرچھائیں تک مجھے نہ چھو سکے۔ ارم نے استعفی کی درخواست تیار کی لیکن دوسرے دن عید کی چھٹی ہونے سے اگلے دن کا انتظار کرنا پڑا۔ عید کا دن کسی کے لئے عذاب جاں بن جاتا ہے! اپنوں کی یاد کس قدر تڑپاتی خون کے آنسو رلاتی ہے۔ بس نہیں چلتا کہ بچھڑے ہوؤں کو ڈھونڈ لائیں جن کے بغیر مسرتوں کا تصور بھی ادھورا ہوتا ہے۔ اسے ماں کی یاد شدت سے آ رہی تھی وہ بچوں کی موجودگی سے بے خبر اپنے کمرے میں بیٹھی یادوں کی تربت پر آنسو بہا رہی تھی کہ دروازے پر مانوس سا کھٹکا ہوا ارم کا دل بری طرح دھڑکنے لگا وہ آنکھوں کو خشک کرتی ہوئی لڑکھڑاتے قدموں سے کھڑکی کے پاس آئی اور پردہ ہٹا کر دیکھا اس کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور ایک بازو سر جھکائے کھڑی ہو گئی "سلام علیکم ۔۔۔۔۔ عید مبارک! کیا عید کے دن گھر آئے مہمان کا اس طرح استقبال کیا جاتا ہے نوید نے کھڑے کھڑے پوچھا "آیئے تشریف لائیے" ارم کا لہجہ سرد سا تھا

"کیا تم ناراض ہو؟" "جی نہیں ناراضگی کیسی؟ میں نہیں چاہتی کہ کوئی مجھ سے خواہ مخواہ ہمدردی کرے مجھ پر رحم کھائے"

ارم کا لہجہ سپاٹ تھا

"بھئی ہمدردی تو انسان ہی کو انسان سے ہوتی ہے"

"نوید صاحب زندگی نے مجھے اتنے فریب دیئے ہیں کہ میں اب اور فریب کھانا نہیں چاہتی خدارا میرے راستے میں آنے کی کوشش نہ کریں" ارم سسک پڑی دکھ کا ایک سنسناتا ہوا احساس نوید کی روح میں اترتا چلا گیا وہ اپنی کرسی ارم کے قریب کر کے بیٹھ گیا "ارم میں تمہارے دکھوں کو سمیٹ لینا چاہتا ہوں میں تمہارا ہاتھ تھامنا چاہتا ہوں اپنے ان آنسوؤں کو پونچھ لو ارم! ادھر دیکھو میری طرف دیکھو" ارم نے نظریں اٹھائیں۔ بڑی بڑی سرخ اور بھیگی ہوئی آنکھوں کو تھام کر آنکھوں سے لگالیا پھر کہا "کل میں تم سے تفصیلی بات کروں گا" وہ تیزی کے ساتھ باہر

نکل گیا۔

دوسرے دن ارم تذبذب کے عالم میں اسکول پہنچی اسے ماحول کچھ پراسرار سا لگ رہا تھا ٹیچرز اور لڑکیاں الگ الگ گروپس بنائے باتوں میں محو تھیں معاملہ سنگین معلوم ہو رہا تھا۔ ارم وزنی قدموں سے اسٹاف روم میں پہنچی کچھ دیر بعد اس کے شاداب چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں معلوم ہوا کہ نوید کی بیوی نے نیند کی گولیاں کھالی ہیں اور دواخانہ میں ہے اس کی حالت خطرہ سے باہر ہے سارا معاملہ ارم کی سمجھ میں آگیا اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پے در پے صدموں نے اس کی روح کے اندر سوراخ کر دیئے تھے ارم نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو چکی تھی پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے لوگ پیچھے کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ معلوم ہوا گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی۔ ارم کی نظر اس شخص پر مرکوز ہو گئی تھی جو گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا مضطرب نگاہوں سے ہر کمپارٹمنٹ میں کسی کو تلاش کر رہا تھا وہ نوید کے سواء کوئی اور نہ تھا۔ ارم نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔